www.KitaboSunnat.com
The Prophet of Our Time
MUHAMMAD
صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم
پیغمبرِ امن
سیرت النبیؐ 21ویں صدی کے نئے چیلنجوں کے تناظر میں
کیرن آرمسٹرانگ
ترجمہ: یاسر جواد

پیغمبرِ امن

سیرت النبیؐ اکیسویں صدی کے نئے چیلنجوں کے تناظر میں

مصنفہ: کیرن آرمسٹرانگ

ترجمہ: یاسر جواد

نگارشات پبلشرز

24- مزنگ روڈ، لاہور
فون 7322892 فیکس 7354205

الحمد مارکیٹ، غزنی سٹریٹ 40- اردو بازار، لاہور
فون 5014066 فیکس 7354205

e-mail:nigarshat@yahoo.com
www.nigarshatpublishers.com

A translation of
"MUHAMMAD:The Prophet of Our Time"
Written by:
Karen Armstrong
Translated by:
Yasir Javvad
Published by:
Asif Javed.

نام کتاب: پیغمبرِ امن
مصنف: کیرن آرمسٹرانگ
ترجمہ: یاسر جواد
ناشر: آصف جاوید
برائے: نگارشات پبلشرز، 24۔مزنگ روڈ، لاہور
PH:0092-42-7322892 FAX:7354205
الحمد مارکیٹ‘ غزنی سٹریٹ 40-اردو بازار، لاہور
PH:0092-42-5014066 FAX:7354205
کمپوزنگ: عبدالستار 0333-4900629
مطبع: حاجی حنیف پرنٹر، لاہور
سال اشاعت: 2009ء
قیمت: =/200 روپے

فہرست

تعارف

مذہبی روایت کی تاریخ ماورائی حقیقت اور دنیاوی اقلیم کے واقعات کے درمیان متواتر مکالمہ ہے۔ صاحب ایمان شخص مقدس ماضی کی چھان بین کرتا اور ایسے اسباق تلاش کرتا ہے جو اس کی زندگی کے حالات سے براہ راست تعلق رکھتے ہوں۔ بیشتر مذاہب میں ایک قائد شخصیت، ایک اعلیٰ مرتبت شخص موجود ہے جو مثالی تصورات کو انسانی صورت میں پیش کرتا ہے۔ گوتم بدھ کی متانت پر مراقبہ کرتے ہوئے بودھی نروان کی مطلق حقیقت دیکھتے ہیں اور ہر بودھی اسی کا خواہشمند ہوتا ہے۔ عیسائیوں نے یسوع میں دنیاوی نیکی اور ہمدردی کے لیے ایک قوت کے طور پر الوہی موجودگی کی جھلک دیکھی۔ یہ راہبر شخصیات عموماً ان تاریک حالات پر روشنی ڈالتی ہیں جن میں اس خطا کار دنیا کے زیادہ تر لوگ نجات پانے کے متمنی ہوتے ہیں۔ وہ ہمیں بتاتے ہیں کہ انسان کیا ہو سکتا ہے۔

مسلمانوں کو ہمیشہ سے اس بات کی تفہیم رہی ہے۔ ان کے صحیفے قرآن نے انہیں ایک مشن عطا کیا ایک عادل اور خلیق معاشرہ تخلیق کرنا جس میں تمام افراد کے ساتھ پر تعظیم سلوک ہو۔ مسلم برادری کی فلاح نہایت اہم معاملہ تھا اور اب بھی ہے۔ کسی مذہبی مثالی تصور (آئیڈیل) کی

طرح اسے بھی شرمندۂ تعبیر کرنا تقریباً ناممکن ہے، لیکن ہر ناکامی کے بعد مسلمانوں نے انھے اور نیا آغاز لینے کی کوشش کی۔ بہت سی اسلامی رسوم فلسفے، عقائد، مقدس کتب اور مقدس مقامات اسلامی معاشرے کے سیاسی واقعات گاہے بگاہے پُرغضب اور خودتنقیدی غوروفکر کا نتیجہ ہیں۔

حضرت محمدؐ (570 تا 632ء) کی زندگی اسلامی آئیڈیل کی تعبیر کے لیے اتنی ہی اہم تھی جتنی آج ہے۔ آپؐ کی زندگی نے دنیا میں خدا کی ناقابل جانچ فعالیت کو منکشف کیا اور کامل اطاعت (اسلام کا لفظی مطلب بھی اطاعت ہے) کی تصویر پیش کی جو ہر انسان کو معبود کے سامنے اختیار کرنی چاہیے۔ آنحضرتؐ کی زندگی میں ہی مسلمانوں نے آپؐ کی زندگی کا مفہوم سمجھنے اور اسے بطور مثال اپنانے کی کوشش شروع کر دی تھی۔ آپؐ کی وفات سے کوئی ایک سو سال بعد، جب اسلام نئے علاقوں میں پھیلا اور نئے پیروکار حاصل کیے، مسلمان دانشوروں نے احادیث اور سنت کی روایات اکٹھی کرنا شروع کر دی تھیں۔ یہی روایات اسلامی شریعت کی بنیاد ہیں۔ سنت نے مسلمانوں کو حضرت محمدؐ کے بات کرنے، کھانے، محبت کرنے، نہانے اور عبادت کرنے کا انداز سکھایا تاکہ وہ اپنی روزمرہ زندگی میں ہر ممکن حد تک ان کی تقلید کریں اور خدا کے کامل اطاعت گزار بنیں۔

تقریباً اسی دور، یعنی آٹھویں اور نویں صدی عیسوی میں پہلے مسلمان مؤرخین نے آنحضرتؐ کی سیرت کے متعلق لکھنا شروع کیا: محمد ابنِ اسحاق (وفات 767ء)؛ محمد ابنِ عمر الواقدی (وفات اندازاً 820ء)؛ محمد ابنِ سعد (وفات 845ء)؛ اور ابو جریر الطبری (وفات 923ء)۔ یہ مؤرخین محض اپنے حافظے اور تاثرات پر انحصار کر رہے تھے، لیکن وہ ایک سنجیدہ تاریخی تعمیرِ نو کی کوشش میں مصروف تھے۔ انہوں نے اپنی تحریروں میں پرانی دستاویزات شامل کیں، زبانی روایات کے ماخذوں کو جانچا، اور وہ آنحضرتؐ کو اللہ کا خصوصی بندہ ماننے کے باوجود مکمل طور پر غیر تنقیدی نہ رہے۔ کافی حد تک اُن کی کاوشوں کے نتیجے میں ہی ہم کسی بھی اور اہم مذہبی روایت کے بانی کی نسبت آنحضرتؐ کے متعلق زیادہ کچھ جانتے ہیں۔ یہ ابتدائی ماخذ ان کی کوئی بھی سیرت لکھنے کے لیے ناگزیر ہیں، اور میں آئندہ صفحات میں جگہ جگہ اُن کا حوالہ دوں گی۔

حضرت محمدؐ کے اولین سوانح نگار غالباً کسی جدید مؤرخ کی تشفی نہ کر پائیں۔ وہ اپنے زمانے

کے لوگ تھے اور انہوں نے اکثر معجزاتی اور افسانوی نوعیت کی کہانیاں بھی شامل کر لیں جن کی تعبیر آج ہم مختلف طور پر کرتے ہیں۔ لیکن وہ اپنے مواد کے الجھاؤ سے آگاہ تھے۔ انہوں نے کسی ایک نظریے یا واقعات کی تفسیر کو بیان کرتے وقت دیگر کو مسترد نہ کیا۔ کبھی کبھی انہوں نے ایک ہی واقعے کے متعلق دو مختلف روایات ساتھ ساتھ پیش کیں اور دونوں کو مساوی وقعت دی تاکہ قارئین اپنے ذہن سے کام لے سکیں۔ وہ اپنی شامل کردہ روایات سے ہمیشہ ہی متفق نہیں تھے، بلکہ اپنے پیغمبر کی کہانی ہر ممکن ایمانداری اور صداقت کے ساتھ بیان کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ان کے بیانات میں رخنے موجود ہیں۔ ہمیں آغاز وحی سے قبل حضرت محمدؐ کی زندگی کے متعلق کچھ بھی علم نہیں۔ ناگزیر طور پر آپؐ کی پیدائش، بچپن لڑکپن اور جوانی کے متعلق قصے وجود میں آ گئے، لیکن یہ تاریخی کی بجائے علامتی اہمیت ہی رکھتے ہیں۔

مکہ میں آنحضرتؐ کی ابتدائی سیاسی زندگی کے بارے میں بہت قلیل مواد دستیاب ہے۔ اس وقت آپؐ نسبتاً غیر مشہور تھے اور کسی بھی شخص نے آپؐ کی سرگرمیوں کو درخور اعتناء نہ سمجھا۔ ہماری معلومات کا مرکزی ماخذ وہ صحیفہ ہے جو ان کے ذریعے عربوں پر اُترا۔ کوئی 23 برس تک 610ء سے لے کر 632ء میں وصال تک — آپؐ نے دعویٰ کیا کہ آپؐ کو براہ راست خدا کی جانب سے پیغامات موصول ہوتے ہیں۔ انہی پیغامات کو مجموعی صورت میں قرآن کہا جاتا ہے۔ یقیناً ان میں آنحضرتؐ کی زندگی کا کوئی دوٹوک بیان موجود نہیں، بلکہ یہ تھوڑا تھوڑا کر کے، آیات اور سورتوں کی شکل میں آپؐ پر نازل ہوا۔ کبھی کبھی وحی مکہ یا مدینہ میں کسی خاص صورتحال کے متعلق ہوتی۔ قرآن میں خدا نے آنحضرتؐ پر تنقید کرنے والوں کو جواب دیا؛ آنحضرتؐ نے مخالفین کے دلائل کا جائزہ لیا؛ آپؐ نے جنگ یا برادری کے اندر کسی تنازعے کی عمیق تر اہمیت اجاگر کی۔ ہر مرتبہ وحی آنے پر مسلمان آیات کو زبانی یاد کر لیتے یا پڑھے لکھے لوگ انہیں لکھ بھی لیتے۔ قرآن کی پہلی باقاعدہ تدوین آنحضرتؐ کی وفات کے 20 برس بعد، تقریباً 650ء میں کی گئی۔ تب اسے قطعی قانون اور ضابطے کی حیثیت حاصل ہوئی۔

قرآن اللہ کا پاک کلام ہے اور اس کی حاکمیتِ و معتبریت مطلق ہے۔ لیکن مسلمانوں کو معلوم ہے کہ قرآن کی تفسیر کرنا ہمیشہ ہی آسان نہیں۔ اس میں پیش کردہ اصول و قوانین ایک چھوٹی سی

برادری کے لیے تھے، لیکن آنحضرت کی وفات سے کوئی ایک صدی بعد مسلمان ہمالیہ سے لے کر پیرانیز (Pyrenees) تک ایک وسیع وعریض بادشاہت پر حکومت کر رہے تھے۔ ان کے حالات آنحضرتؐ اور ابتدائی مسلمانوں کے حالات سے قطعی مختلف تھے، لہٰذا اسلام کو تبدیل ہونا اور تطابق اختیار کرنا پڑا۔ مسلم تاریخ میں اولین مضامین جاری مسائل پر لکھے گئے۔ مسلمان آنحضرتؐ کی بصیرتوں اور سنت کو اپنے زمانے پر کیسے لاگو کر سکتے تھے؟ ابتدائی سیرت نگاروں نے جب آنحضرتؐ کی زندگی کی کہانی ترتیب دی تو قرآن کے کسی اقتباس کی وضاحت کرنے کے لیے اس تاریخی سیاق وسباق کو سامنے رکھا جس میں وہ مخصوص آیات نازل ہوئی تھیں۔ مخصوص قرآنی تعلیم کی علت کو سمجھنے کے ذریعے وہ تمثیل کے ایک منظم عمل کے تحت اس کا تعلق اپنی صورتحال کے ساتھ جوڑ سکتے تھے۔ اس دور کے مورخین اور مفکرین کو یقین تھا کہ ساتویں صدی میں کلام الٰہی کا بول بالا کرنے کے لیے آنحضرتؐ کی کوششوں کے متعلق جاننا انہیں اپنے عہد میں وہی جذبہ زندہ کرنے میں مدد دے گا۔ بہت ابتداء سے ہی آنحضرتؐ کی سیرت نگاری محض ماضی کی کھوج کا عمل نہیں تھا۔ یہ عمل آج بھی جاری ہے۔ کچھ مسلمان قدامت پسندوں نے اپنی عسکریت پسندانہ آئیڈیالوجی کی بنیاد حضرت محمدؐ کی زندگی پر رکھی؛ مسلمان انتہا پسند یقین رکھتے تھے کہ آنحضرتؐ ان کی چیرہ دستیوں کو سراہتے ہوں گے۔ دیگر مسلمانوں نے ان دعووں کو ناپسند کیا اور قرآن کی غیر معمولی اجتماعیت پسندی کا حوالہ دیا جس میں جارحیت کو مسترد کیا گیا اور تمام راست رو مذاہب کا ماخذ ایک ہی خدا کو بتایا گیا۔ مغربی دنیا میں اسلام سے خوف کھانے کی تاریخ کافی طویل ہے جس کے ڈانڈے صلیبی جنگوں کے عہد سے جا ملتے ہیں۔ بارہویں صدی عیسوی میں یورپ کے عیسائی راہبوں نے اصرار کیا کہ اسلام پرتشدد اور شمشیری مذہب تھا، اور آنحضرتؐ نے (نعوذ باللہ) بزورِ شمشیر متذبذب دنیا پر اپنا مذہب نافذ کیا۔ انہوں نے آنحضرتؐ پر جنسی حوالے سے بہتان طرازی کی۔ آنحضرتؐ کی زندگی کی یہ مسخ شدہ تصویر مغرب کے مقبول تصورات میں سے ایک بن گئی اور اہل مغرب نے آنحضرتؐ کو معروضی روشنی میں دیکھنا ہمیشہ مشکل پایا۔ 11 ستمبر 2001ء کو ورلڈ ٹریڈ سنٹر کی تباہی کے بعد سے امریکہ اور مغربی میڈیا میں دائیں بازو کے عیسائی لوگ دشمنی کی اس روایت کو جاری رکھتے ہوئے دعوے کر رہے ہیں کہ آنحضرتؐ جنگ کے زبردست حامی تھے۔ گویا

ہر قسم کے تشدد اور جارحیت کو ان کی ذات سے منسوب کرنے کی کوششیں کی گئیں۔

اب ہم اس قسم کی تعصبیت میں گھرے رہنا مزید گوارا نہیں کر سکتے کیونکہ یہ انتہا پسندوں کے لیے ایک تحفہ ہے جو اس قسم کے بیانات یہ "ثابت کرنے" کے لیے استعمال کر سکتے ہیں کہ مغربی دنیا واقعی اسلامی دنیا کے خلاف نئی صلیبی جنگ میں مشغول ہے۔ حضرت محمدؐ تشدد پسند ہرگز نہیں تھے۔ ہمیں متوازن انداز میں ان کی حیات کو سمجھنا ہوگا تاکہ ان کی عظیم کامیابیوں کی قدر افزائی کر سکیں۔ بے جا تعصب سے ہونے والے نقصانات کا ازالہ رواداری، آزاد خیالی اور ہمدردی کے ساتھ کیا جا سکتا ہے جنہیں مغربی ثقافت کا وصف خیال کیا جاتا ہے۔

میں تیرہ برس قبل اس بات کی قائل ہوئی جب آیت اللہ خمینی نے سلمان رشدی (ملعون) اور اس کے پبلشروں کی موت کا فتویٰ جاری کیا۔ میں فتوے کو بے فائدہ سمجھتی تھی، لیکن رُشدی کے کچھ لبرل حامیوں کے خیالات سے بہت پریشان ہوئی جو فتوے کو مسترد کرنے کے بہانے مذہب اسلام کی تردید کرنے میں مصروف تھے، حالانکہ قتل کے فتوے اور مذہب اسلام کا کوئی تعلق نہیں۔ قرون وسطیٰ کے مغربی تعصب کو دوبارہ زندہ کرنے کے ذریعے ایک لبرل اصول کا دفاع کرنا مجھے غلط لگا۔ لگتا تھا کہ ہم نے 1930ء کی دہائی کے المیے سے کوئی سبق نہیں سیکھا جب اسی قسم کی تنگ نظری نے ہٹلر کو 60 لاکھ یہودیوں کا قتل کرنے کے قابل بنایا، لیکن میں نے محسوس کیا کہ بہت سے مغربی لوگوں کے پاس حضرت محمدؐ کے متعلق اپنے تاثرات تبدیل کرنے کا موقعہ نہیں تھا، لہٰذا اس تنگ نظری کو چیلنج کرنے کی خاطر آپؐ کی سیرت لکھنے کا فیصلہ کیا۔ نتیجتاً میری کتاب "Muhammad: A Biography of Prophet" منظرِ عام پر آئی (1991ء)۔ لیکن 11 ستمبر کے پس منظر میں ہمیں آنحضرتؐ کی زندگی کے دیگر پہلوؤں پر توجہ مرکوز کرنے کی ضرورت ہے۔ چنانچہ یہ ایک بالکل نئی اور مختلف کتاب ہے۔ میرے خیال میں یہ تحریر 11 ستمبر سے بعد کی دنیا کے خوفناک حقائق پر زیادہ براہ راست نکتۂ نظر پیش کرتی ہے۔

ایک راہنما شخصیت کے طور پر حضرت محمدؐ کی حیات نہ صرف مسلمانوں بلکہ اہل مغرب کے لیے بھی اہم اسباق رکھتی ہے۔ آپؐ کی زندگی ایک جہاد تھی: جیسا کہ ہم اس کتاب میں غور کریں گے کہ اس لفظ کا مطلب صرف "مقدس جنگ" نہیں بلکہ "جدوجہد" ہے۔ حضرت محمدؐ نے جنگ زدہ

عربیہ میں امن قائم کرنے کی سخت کوشش کی، اور آج ہمیں یہ کام کرنے والے لوگوں کی ضرورت ہے۔ آپؐ کی زندگی طمع، ناانصافی اور جہالت کے خلاف ایک بلا تکان جدوجہد سے عبارت تھی۔ آپؐ نے محسوس کیا کہ عربیہ ایک اہم موڑ مڑ رہا تھا اور سوچ کے پرانے انداز کافی نہیں رہے تھے، چنانچہ آپؐ خود میدانِ عمل میں اترے تاکہ ایک بالکل نیا حل وضع کر سکیں۔ 11 ستمبر کو ہم تاریخ کے ایک نئے دور میں داخل ہوئے اور ہمیں ایک مختلف نکتہ نظر پیدا کرنے کے لیے اتنی ہی تندہی سے کوشش کرنا ہوگی۔

عجیب بات ہے کہ ساتویں صدی کے عربیہ میں رونما ہونے والے واقعات ہمیں اپنے عہد کے واقعات اور ان کی تہہ میں موجود اہمیت کے متعلق کافی کچھ سکھاتے ہیں۔ یہ اسباق سیاست دانوں کی کھوکھلی نعرہ بازی کی نسبت کہیں زیادہ عمیق ہیں۔ حضرت محمدؐ راسخ العقیدگی نافذ کرنے کی کوشش میں نہیں تھے— آپؐ کو مابعد الطبیعیات میں زیادہ دلچسپی نہ تھی— بلکہ آپؐ لوگوں کے ذہن و دل میں تبدیلی پیدا کرنا چاہتے تھے۔ آپؐ نے اپنے عہد کے غالب جذبے کو ''جاہلیہ'' کا نام دیا۔ مسلمان عموماً اس کا ترجمہ ''عہد جہالت'' کے طور پر کرتے ہیں— یعنی قبل از اسلام عربیہ کا عہد۔ لیکن حالیہ تحقیق کے مطابق حضرت محمدؐ نے یہ اصطلاح ایک تاریخی عہد کے لیے نہیں بلکہ ایک ذہنی کیفیت کے لیے استعمال کی جو ساتویں صدی کے عربیہ میں تشدد اور دہشت کا باعث بنی (جہالت کا مادہ جُہل جبکہ جاہلیت کا مادہ جہل ہے، مترجم)۔ میں تو کہوں گی کہ آج کی مسلم دنیا کے ساتھ ساتھ مغرب میں بھی جاہلیہ کے شواہد موجود ہیں۔

متناقض بالذات طور پر (Paradonically) حضرت محمدؐ ایک بے زماں شخصیت بن گئے کیونکہ وہ اپنے عہد میں نہایت گہری جڑیں رکھتے تھے۔ ہم آپؐ کی کامیابی کو تبھی سمجھ سکتے ہیں جب یہ جان لیں کہ آپؐ کس چیز کے خلاف تھے۔ اپنی موجودہ حالت میں آپؐ کی حصہ داری دیکھنے کی خاطر ہمیں اس المناک دنیا میں داخل ہونا ہوگا جس میں وہ کوئی چودہ سو سال قبل پیغمبرِ اسلام معبوث ہوئے— مکہ کے مقدس شہر سے قریب ایک پہاڑی چوٹی پر۔

❖

باب 1

مکّہ

آنحضرتؐ نے اس تجربے کو بیان کرنا تقریباً ناممکن پایا جب آپ لرزاں و خیزاں پہاڑی سے اتر کر اپنی بیوی حضرت خدیجہؓ کے پاس آئے تھے۔ آپ کو لگا تھا کہ ایک پُر جلال اور ہیبت ناک ہستی اس غار میں گھس آئی تھی جہاں آپؐ سو رہے تھے۔ اس ہستی نے آنحضرتؐ کو زور سے اپنے ساتھ بھینچا تھا۔ ہیبت زدگی کے عالم میں آپؐ نے سوچا کہ شاید کسی جن نے حملہ کیا تھا۔ یہ جن ناری روحیں تھیں جو اکثر عریبیہ کی سٹیپیوں پر منڈلاتے اور گاہے بگاہے مسافروں کو راہ سے بھٹکاتے رہتے تھے۔ جنات نے گویوں اور عریبیہ کے فال گیروں کو بھی فیض بخشا تھا۔ ایک شاعر نے اپنی شاعرانہ کیفیت کو زبردست حملے کے طور پر بیان کیا: اس کے ذاتی جن نے بلا انتباہ اسے زمین پر پھینک دیا اور اشعار زبردستی اس کے منہ سے نکلوائے۔(1) چنانچہ جب حضرت محمدؐ نے "پڑھو!" کا حکم سنا تو یہی سمجھے کہ آپؐ پر بھی جن وارد ہوا ہے۔ آپؐ نے کہا، "میں شاعر نہیں ہوں۔" لیکن حملہ

آور ہستی نے آپ کو دوبارہ بھینچا اور یہ عمل برداشت سے باہر ہو گیا تو نئے عربی صحیفے کے ابتدائی الفاظ خود بخود اپنے لبوں سے جاری ہو گئے۔

حضرت محمدؐ نے یہ رویا 610ء میں ماہ رمضان کے دوران دیکھی۔ بعد ازاں آپؐ نے اسے ''لیلتہ القدر'' (قسمت کی رات) قرار دیا کیونکہ اس رات آپؐ عربیہ کے اعلیٰ ترین معبود اللہ کے پیغمبر بن گئے تھے، لیکن اس وقت تک اصل بات نہیں جانتے تھے۔ آنحضرتؐ کی عمر چالیس برس تھی، آپؐ صاحب خانہ شخص، حجاز کے پھلتے پھولتے ہوئے شہر مکہ میں ایک محترم تاجر تھے۔ اپنے عہد کے زیادہ تر عربوں کی طرح آنحضرتؐ بھی حضرت نوحؑ، حضرت لوطؑ، حضرت ابراہیمؑ، حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ کی کہانیوں سے واقف تھے اور یہ بھی جانتے تھے کہ کچھ لوگ ایک عرب پیغمبر کے منتظر تھے، لیکن انہیں کبھی یہ خیال نہ آیا کہ یہ مشن خود آپؐ کو ہی سونپا جائے گا۔ درحقیقت غار سے باہر نکلنے اور کوہِ حرا کی ڈھلانوں سے نیچے اترنے کے بعد آپ کو ایک مایوسی نے گرفت میں لے لیا۔ اللہ انہیں کسی جن سے کیسے مغلوب کر سکتا تھا؟ جنات متلون مزاج تھے؛ وہ لوگوں کو بھٹکانے کی وجہ سے بدنام طور پر ناقابل اعتبار تھے۔ مکہ میں حالات کشیدہ تھے۔ ان کے قبیلے کو ایک جن کی خطرناک راہنمائی کی ضرورت نہ تھی۔ وہ اللہ کی براہ راست مداخلت کے خواہشمند تھے جو ماضی میں ہمیشہ ایک رسائی سے باہر ہستی رہا تھا اور بہت سوں کو یقین تھا کہ اللہ یہودیوں اور عیسائیوں کا معبود خدا ہی تھا۔ (عربی میں لفظ اللہ کا مطلب ''خدا'' ہی ہے)۔

مکہ نے حیرت انگیز کامیابی حاصل کی تھی۔ شہر اب بین الاقوامی تجارتی مرکز تھا اور اس کے تاجر اور سرمایہ کار اپنے تصور سے بھی زیادہ امیر ہو گئے تھے۔ صرف چند پشتیں قبل ان کے اجداد شمالی عرب کے بنجر صحراؤں میں مایوس کن اور جانکاہ زندگی گزارا کرتے تھے۔ ان کی کامیابی غیر معمولی تھی، کیونکہ بیشتر عرب شہروں کے باسی نہیں بلکہ خانہ بدوش تھے۔ زمین اس قدر بنجر تھی کہ لوگ پانی اور چراگاہوں کی تلاش میں غیر مختتم طور پر ایک سے دوسرے مقام تک گھوم پھر کر ہی زندہ رہ سکتے تھے۔ نسبتاً اونچی زمین پر چند ایک زرعی آبادیاں موجود تھیں، جیسے طائف جو مکہ کو زیادہ تر خوراک مہیا کرتا تھا، اور شمال میں 250 میل دور یثرب۔ لیکن دیگر جگہوں پر کاشت کاری اور نتیجتاً مستقل آبادی ستیپیوں میں ناممکن تھی، لہٰذا خانہ بدوش بھیڑیں اور بکریاں چرا کر اور گھوڑے واونٹ

پال کر بہ مشکل گزارا کرتے اور قرابتی قبائلی گروہوں میں رہتے تھے۔ بدوی زندگی ایک متواتر اور ظالمانہ جدوجہد تھی کیونکہ قلیل ذرائع کے لیے بہت سے لوگ مقابلہ بازی کر رہے تھے۔ ہمیشہ سے بھوک، متواتر فاقوں کے خطرے میں مبتلا بدوؤں نے پانی اور چراگاہ کے لیے دیگر قبائل کے ساتھ مسلسل لڑائیاں لڑی تھیں۔

نتیجتاً ''غزو'' یعنی اشیا حاصل کرنے کے لیے حملہ بدوی معیشت میں اساسی اہمیت اختیار کر گیا۔ احتیاج کے ادوار میں قبائل باقاعدگی سے اپنے پڑوسیوں کے علاقوں پر حملے کرتے تاکہ اونٹ، مویشی یا غلام حاصل کر سکیں۔ وہ کسی بھی شخص کی جان لینے سے خاص طور پر دامن بچاتے کیونکہ قصاص دینا پڑ سکتا تھا۔ کسی بھی شخص نے ان باتوں کو ہرگز قابلِ نفرین نہ سمجھا۔ غزو زندگی کی ایک قبول شدہ حقیقت تھا؛ اس کے پیچھے کوئی سیاسی یا ذاتی نفرت کارفرما نہیں تھی، بلکہ ایک قسم کی قومی تفریح ملوث تھی۔ یہ کھیل مہارت کے ساتھ اور طے شدہ اصولوں کے مطابق کھیلا جاتا۔ یہ ایک ضرورت تھی، خطے میں دولت کی تقسیم نو کا ایک درشت اور فوری طریقہ۔

اگرچہ اہل مکہ اپنی خانہ بدوش زندگی کو پیچھے چھوڑ چکے تھے، لیکن وہ اب بھی بدوؤں کو معتبر و مستند عرب ثقافت کے امین خیال کرتے تھے۔ بچپن میں حضرت محمدؐ کو اپنی دایا کے قبیلے کے ساتھ صحرا میں رہنے کے لیے بھیجا گیا تاکہ آپ بدوی طور طریقوں سے آشنا ہو سکیں۔ اس چیز نے آپؐ کی شخصیت پر گہرے نقوش مرتب کیے۔ بدو روایتی مذہب میں زیادہ دلچسپی نہیں رکھتے تھے۔ انہیں حیات بعد الموت کی کوئی زیادہ توقع نہ تھی اور اپنے دیوتاؤں پر بھی زیادہ یقین نہیں رکھتے تھے جو ان کے مشکل ماحول پر کوئی اثر ڈالنے کے قابل نہیں لگتے تھے۔ دیوتا نہیں بلکہ قبیلہ مطلق قدر تھا اور ہر رکن کے لیے لازمی تھا کہ وہ نجی ضروریات اور خواہشات کو گروپ کی فلاح پر قربان کرے اور ضرورت پڑنے پر تادم آخر قبیلے کی خاطر جنگ کرے۔ مافوق الفطرت کے متعلق قیاس آرائی کے لیے عربوں کے پاس بہت کم وقت تھا لیکن یہ دنیا ان کی توجہ کا مرکز و محور تھی۔ ستیپیوں میں تخیل بے کار تھا؛ انہیں نتائجیت پسندانہ، متین حقیقت پسندی درکار تھی لیکن انہوں نے ایک جنگجوئی ضابطہ وضع کیا تھا جو ان کی زندگیوں کو مفہوم دینے اور سخت گیر حالات میں مایوسی سے بچانے کے ذریعے مذہب کا اساسی وظیفہ انجام دیتا تھا۔ انہوں نے اسے ''مروۃ'' (مروت) کا نام دیا جس کا ترجمہ

کرنا آسان نہیں۔ مروت کا مطلب شجاعت، صبر، برداشت تھا؛ یہ گروپ کے ساتھ ہونے والی کسی بھی زیادتی کا بدلہ لینے، کمزور ارکان کو تحفظ دینے اور دشمنوں کو دور رکھنے کے جذبے پر مشتمل تھی۔ قبیلے کا وقار محفوظ رکھنے کے لیے ہر رکن کا لمحے بھر کے نوٹس پر اپنے قرابت داروں کی مدد کے لیے تیار رہنا اور بلا چوں وچرا اپنے سردار کی اطاعت کرنا ضروری تھا۔

سب سے بڑھ کر، قبائلی شخص کو فیاض اور اپنے مویشیوں اور خوراک کو دوسروں کے ساتھ بانٹنے پر مائل ہونا ضروری تھا۔ اگر لوگ خودغرضانہ انداز میں اپنی دولت جمع کرتے رہتے اور دوسرے بھوکے رہتے تو سٹیپیوں میں زندگی ناممکن ہو جاتی۔ آج کا امیر قبیلہ کل بہ آسانی مفلوک الحال ہو سکتا تھا۔ اگر آپ اچھے دنوں میں کنجوسی سے کام لیتے تو ضرورت کے وقت کون آپ کی مدد کو آتا؟ اسی ضرورت کے باعث مروت ایک خوبی بن گئی اور اس نے ''کریم'' (مہربان ہیرو) کو مادی اشیا کو زیادہ اہمیت نہ دینے پر مائل کیا تاکہ وہ اپنی محرومی کی زندگی سے دب کر نہ رہ جائے۔ حقیقی معنوں میں شریف بد دکل کی کوئی فکر نہ کرتا، مہمانوں کے ساتھ فیاضانہ سلوک کرتا اور ساتھی قبائلیوں کو اپنی استعداد سے بڑھ کر اہمیت دیتا۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ اپنی ساری دولت ــــ اپنے اونٹ، ریوڑ اور غلام دوسروں کو دینے پر تیار رہے اور اپنی ساری دولت دوستوں اور حلیفوں کے لیے ایک زبردست ضیافت میں خرچ کر ڈالنے کے قابل ہو۔ لیکن ''کریم'' کی فیاضی اپنی تباہی کا باعث اور انا پرستانہ بن سکتی تھی۔ ہو سکتا تھا کہ وہ محض اپنی رگوں میں جاری و ساری اقدار کا مظاہرہ کرنے اور اپنی حیثیت و شہرت کو فروغ دینے کی خاطر رات بھر میں ہی اپنے گھرانے کو غربت سے دوچار کر دیتا۔

مروت ایک تحریک انگیز مثالی تصور تھی، لیکن چھٹی صدی عیسوی کے آخر میں اس کے نقائص المناک طور پر عیاں ہونے لگے تھے۔ قبائلی یگانگت (عصبیۃ) نے بہادری اور بے لوثی کو بڑھاوا دیا، لیکن صرف قبیلے کے سیاق وسباق میں۔ ہمہ گیر انسانی حقوق کا کوئی تصور موجود نہ تھا۔ بدو خود کو اپنے اخیافی رشتہ داروں اور حلیفوں کے لیے ذمہ دار محسوس کرتا تھا۔ اسے غیروں سے کوئی سروکار نہ تھا جنہیں وہ بے وقعت اور بے کار سمجھتا۔ اگر اپنے لوگوں کے فائدے کی خاطر دوسرے کو قتل کرنا پڑتا تو وہ کوئی اخلاقی بندش محسوس نہ کرتا اور فلسفیانہ تجریدات یا اخلاقیاتی سوچ بچار میں کوئی وقت

ضائع نہ کرتا۔ چونکہ قبیلہ مقدس ترین قدر تھا، اس لیے ہر درست یا غلط معاملے میں اس کی حمایت کرتا۔ ایک شاعر نے کہا، ''میں غزیہ کا ہوں۔ اگر وہ غلطی پر ہے تو میں بھی غلطی پر رہوں گا؛ اور اگر غزیہ راست رو ہے تو میں اسی کے ساتھ رہوں گا۔''(2) یا بقول شخصے، ''اپنے بھائی کی مدد کرو چاہے اس کے ساتھ زیادتی کی گئی ہو یا وہ دوسروں کے ساتھ زیادتی کر رہا ہو۔''(3)

ہر قبیلے میں اپنی اپنی قسم کی مروت رائج تھی۔ عربوں کو یقین تھا کہ یہ وصف قبیلے کے بانی اجداد سے ورثہ میں منتقل ہوا اور دیگر جسمانی و ذہنی اوصاف کی طرح پشت در پشت چلتا آیا تھا۔ انہوں نے اس قبائلی رفعت کو ''حسب'' (اجدادی وقار) کہا۔(4) قبائلی اپنے مخصوص جوہر کے منبع کے طور پر اجداد کو حاکم اعلیٰ کی حیثیت میں پوجتے تھے اور اس چیز نے ناگزیر طور پر ایک عمیق رجعت پسندی کو بڑھاوا دیا۔ قدماً سے اولادوں کو ورثہ میں ملنے والا انداز حیات (''سنت'') مقدس اور ناقابل گریز تھا۔ ایک اور شاعر نے وضاحت کی: ''وہ ایک ایسے قبیلے سے تعلق رکھتا ہے جس کے اجداد نے ان کے لیے ایک سنت مہیا کی۔ ہر قبیلے کی اپنی اپنی روایتی سنت ہے؛ ہر قبیلے کے اپنے قابل تقلید مثالی نمونے ہیں۔''(5) اجداد کے دستور سے کوئی بھی انحراف — چاہے کتنا ہی معمولی — ایک عظیم برائی تھا۔ کوئی دستور صرف اپنی خلقی بلند پائیگی کی وجہ سے نہیں بلکہ اس لیے منظور شدہ تھا کہ قبیلے کے باپ دادا طویل عرصہ سے اس پر عمل کرتے آئے تھے۔

بدو لوگ تجربہ کرنے کی استطاعت نہیں رکھتے تھے۔ شریعہ کو نظر انداز کرنا ایک مجرمانہ غیر ذمہ داری تھی۔ شریعہ نامعلوم زمانے سے آپ کے لوگوں کا سرچشمۂ حیات تھا۔ آپ ایک مجموعۂ اقدار کی پیروی کرتے ہوئے زندہ رہنا سیکھتے تھے اور یہ اقدار تجربے کی کسوٹی پر آزمائی ہوئی تھیں۔ لیکن روایت کی یہ ناقابل سوال قبولیت کٹر شاوٗنزم تک پہنچا سکتی تھی: آپ کے اپنے لوگوں کی سنت بہترین تھی اور آپ کسی اور انداز عمل کا سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ آپ کسی بھی اور، انسانی یا الوہی حاکمیت کے سامنے سر جھکانے سے انکار کر کے ہی اپنے قبیلے کا وقار محفوظ رکھ سکتے تھے۔ کریم سے توقع کی جاتی کہ وہ فخر مند، خود پسند، خود انحصار اور جارحانہ طور پر خود مختار ہوگا۔ گھمنڈ ایک نقص نہیں بلکہ باعثِ شرف چیز تھا، جبکہ انکساری آپ کو ناقص النسل اور بزدل ثابت کرتی تھی۔ پست حسب نسب کا مالک شخص جینیاتی طور پر محض غلام (عبد) بننے کے لائق تھا۔ حقیقی کریم کسی کے بھی سامنے

سر نہیں جھکا سکتا تھا۔ ایک شاعر نے کہا، ''ہم ان کی قیادت کو مسترد کرتے اور انہیں لگاموں کے بغیر خود چلاتے ہیں!''[6] کریم شخص کسی دیوتا کے حضور بھی یہ خود انحصاری قائم رکھتا، کیونکہ کوئی بھی دیوتا حقیقی اعلیٰ انسان سے برتر نہیں ہو سکتا تھا۔

سٹیپیوں میں قبیلے کو ایسے آدمیوں کی ضرورت تھی جو حالات کے سامنے سر نہ جھکاتے اور نہایت نامساعد حالات میں بھی جم کر کھڑے رہ سکتے۔ لیکن پُر غرور خود انحصاری (استغناء) بہ آسانی ظالمانہ اور جابرانہ بن سکتی تھی۔ ہلکی سی اشتعال انگیزی بھی بدو کو بہ آسانی متحرک کر دیتی۔[7] رفیع الشان ہونے کے احساس کی وجہ سے وہ کسی بھی خطرے یا دھمکی کا زوردار انداز میں جواب دیتا۔ وہ محض اپنے دفاع میں ہی عمل نہیں کرتا تھا؛ حقیقی شجاعت پیشگی حملے میں مضمر تھی۔ کسی ''جنگجو کے لیے شیر جیسا غضبناک'' ہونا کافی نہیں۔ شاعر زہیر ابن ابی سلمیٰ نے کہا، ''جنگجو کا دشمن کو جواب دینے اور سبق سکھانے کے قابل ہونا کافی نہیں، بلکہ اسے پہلے حملہ کرنا اور کسی کی زیادتی کے بغیر جارحیت اختیار کرنا چاہیے۔''[8]

قبائلی شعراء کی جانب سے سراہی گئی شجاعت ایک ناقابل مدافعت جذبہ تھی جسے قابو میں رکھا جا سکتا تھا اور نہ ہی رکھنا چاہیے تھا۔ اگر قبیلے کے ایک فرد کے ساتھ بھی کوئی زیادتی ہوتی تو 'کریم' جسمانی اذیت اور تکلیف دہ پیاس کے طور پر انتقام لینا اپنا فرض سمجھتا۔[9] یہ ایک المناک نظریہ دُنیا تھا۔ بدو اپنی جدوجہد کی تحلیل کی کوشش کرتے، لیکن ان کی زندگی سنگدلانہ تھی اور کسی بہتری کی کوئی امید نہ تھی۔ وہ یقین رکھتے تھے کہ تمام ہستیاں ''دہر'' (زمانہ یا مقدر) سے مغلوب تھیں جس نے انسانیت پر ہر قسم کی تکلیف نازل کی۔ تمام چیزیں فراموش ہو جاتیں؛ حتیٰ کہ کامیاب سورما بھی مرتا اور بھلا دیا جاتا۔ غیر مختتم جدوجہد کی اس زندگی میں ایک خلقی بے مقصدیت موجود تھی۔ مایوسی کا واحد حل پُر مسرت زندگی تھی — بالخصوص شراب کی فراموش گاری۔

ماضی میں بہت سے بدوؤں نے سٹیپیوں سے بھاگ نکلنے اور ایک زیادہ محفوظ اور آباد (حضرۃ) زندگی بنانے کی کوشش کی تھی، لیکن عموماً پانی اور قابل کاشت زمین کی قلت نے ان کوششوں کو ناکام بنایا۔[10] کوئی قبیلہ اس وقت تک ایک کارآمد بستی نہیں بسا سکتا تھا جب تک وہ فالتو دولت نہ جمع کر لیتا، جو تقریباً ناممکن تھا — یا کسی نخلستان پر قبضہ نہ جما لیتا، جیسا کہ طائف میں

ثقیف کے قبیلے نے کیا تھا۔ دوسرا متبادل خطے کی دو یا زائد تہذیبوں کے درمیان وسیلہ بن جاتا تھا۔ مثلاً موسم سرما بازنطینی سلطنت کی سرحد پر گزارنے والے بنو غسان یونانیوں کے مؤکل بن گئے، عیسائیت قبول کی اور بازنطین کو فارس سے تحفظ دینے کے لیے ایک بفر سٹیٹ تشکیل دی۔ لیکن چھٹی صدی کے دوران ذرائع نقل و حمل میں انقلاب کے نتیجے میں ایک نیا موقعہ میسر آیا۔ بدوؤں نے ایک کاٹھی (Saddle) ایجاد کی تھی جس نے اونٹوں کو پہلے کی نسبت زیادہ بھاری بوجھ اٹھانے کے قابل بنا دیا، اور ہندوستان، مشرقی افریقہ، یمن و بحرین کے تاجر اپنی گدھا گاڑیوں کی جگہ اونٹ استعمال کرنے لگے جو پانی کے بغیر کئی دن زندہ رہ سکتے تھے اور صحرا پیمائی کے لیے موزوں ترین تھے۔ چنانچہ اشیائے تعیش — لوبان، مسالے، ہاتھی دانت، موتی، لکڑی، پارچے اور ادویات — کی تجارت کرنے والے غیر ملکی تاجر عرب سے گریز کرنے کی بجائے اپنے کاروانوں کو لے کر سٹیپوں سے گزرنے لگے جو بازنطین اور شام کے درمیان زیادہ براہ راست راستہ تھا۔ انہوں نے بدوؤں کو اپنے سامان تجارت کی حفاظت، شتربانی اور ایک سے دوسرے کنوئیں تک راہ نمائی کے لیے ملازم رکھا۔

مکہ شمال کی جانب جاتے ہوئے ان کاروانوں کی جائے قیام بن گیا۔ یہ حجاز کے مرکز میں باسہولت جگہ پر واقع تھا، اور ایک ٹھوس (ناقابل زراعت) پہاڑ پر بنے ہونے کے باوجود ایک زیر زمین آبی چشمے زمزم کی وجہ سے آبادی ممکن ہوئی۔ بنجر خطے میں معجزاتی لگنے والے اس چشمے کی دریافت نے غالباً مکہ میں ایک شہر بسنے سے بہت پہلے ہی اس مقام کو بدوؤں کے لیے مقدس بنا دیا ہوگا۔ سارے زائرین یہاں آتے اور گرینائیٹ سے بنا ہوا مکعب شکل کا کعبہ کافی قدیم عمارت تھی، یہاں غالباً زمزم کے مسلک سے متعلقہ ضروری اشیا رکھی جاتی ہوں گی۔ پانچویں اور چھٹی صدی کے دوران چشمہ اور حرم یکے بعد دیگرے مختلف خانہ بدوش قبائل کی نگرانی میں رہے: جرہم، خزاعہ اور انجام کار چھٹی صدی کی ابتدا میں قریش جنہوں نے اپنے پیش روؤں کو بے دخل کیا اور پہلی مرتبہ کعبہ کے اردگرد مستقل رہائش گاہیں تعمیر کیں۔

قریش کا جدِ امجد قصیٰ ابن کلاب تھا جو خون اور شادی کے ڈھیلے سے بندھن میں بندھے ہوئے

متعدد متحارب قبیلوں کو قریب لایا اور یہ نیا قبیلہ تشکیل دیا۔ اسی زمانے میں مکہ طویل فاصلے کی تجارت کا مقبول عام مرکز بنتا جا رہا تھا۔ قریش کا نام غالباً ''تقرش'' (جمع کرنا یا حاصل کرنا) سے مشتق ہے۔ جرہم اور خزاعہ — جو بدوہ کو ترک نہیں کر پائے تھے — کے برعکس انہوں نے فالتو سرمایہ حاصل کیا اور ایک مستقل انداز حیات کو ممکن بنایا۔ پہلے انہوں نے شمال جنوب تجارت پر اجارہ قائم کیا، لہٰذا غیر ملکی کاروانوں کو ٹھہرانے کی اجازت صرف انہیں تھی۔ وہ عرب کے اندر تاجرانہ سرگرمی پر کنٹرول کرنے کے قابل بنے جو بین الاقوامی تجارت سے تحریک یافتہ تھی۔ چھٹی صدی کے نصف اول کے دوران بدوی قبائل ایک دوسرے کے ساتھ اشیاء کا لین دین کرنے لگے تھے۔[12] تاجر مستقل منڈیوں میں جمع ہوتے جو ہر سال عرب کے مختلف علاقوں میں لگتی تھیں۔ ان کی ترتیب ایسے رکھی گئی کہ تاجر جزیرہ نما کو ایک گھڑی کے رخ پر گھیرتے۔ سال کی پہلی منڈی (سوق) بحرین میں منعقد ہوتی جو نہایت گنجان آباد خطہ تھا۔ اس کے بعد عمان، حضرموت اور یمن کی باری آتی اور چکر مکہ میں اور آس پاس یکے بعد دیگرے پانچ سوقوں پر منتج ہوتا تھا۔ سال کا آخری میلہ ماہ حج سے عین پہلے عکاظ میں لگتا تھا — حج مکہ اور کعبہ کی سالانہ زیارت کی روایت تھی۔

چھٹی صدی عیسوی کے نصف اول میں قریش نے تجارتی قافلے شام اور یمن بھیجنا شروع کر دیے اور آہستہ آہستہ خود کو آزاد تاجروں کی حیثیت میں منوایا۔ لیکن اس کامیابی کے باوجود وہ اپنے زد پذیر ہونے کے متعلق جانتے تھے۔ مکہ میں تجارت ممکن نہ ہونے کے باعث انہوں نے مکمل طور پر تبادلۂ اشیا پر انحصار کیا۔ چنانچہ اگر معیشت میں ناکامی ہو جاتی تو وہ فاقوں مر جاتے۔ لہٰذا ہر شخص تجارت میں ملوث تھا — بینک کار، سرمایہ کار یا تاجر کی حیثیت میں۔ زرعی آبادیوں میں بدوی روح واقعی سالم رہی کیونکہ یہ کاشت کاری کے ساتھ زیادہ مطابقت پذیر تھی۔ لیکن قریش ایک سخت گیر تجارتی دستور بنانے پر مجبور تھے جس نے ان سے مروۃ کی کئی روایتی اقدار چھین لیں ..... مثلاً وہ پرامن لوگ بن گئے، کیونکہ سٹیپیوں میں پھیلی ہوئی جنگ و جدل کی وبا کاروبار کو ناممکن بنا دیتی۔ مکہ کو ایک ایسی جگہ بنتا تھا جہاں کسی بھی قبیلے سے تعلق رکھنے والے تاجر بلا خوف و خطر آزادانہ ملتے۔ چنانچہ قریش نے اصولی بنیادوں پر قبائلی جنگ و جدل میں حصہ لینے سے انکار کر دیا اور غیر جانب داری اختیار کی۔ ان کی آمد سے قبل زمزم اور کعبہ کے گرد اکثر خونیں لڑائیاں ہوا کرتی تھیں کیونکہ

حریف قبائل ان محترم مقامات پر قبضہ جمانے کی کوششیں کرتے۔ اب زبردست مہارت کے ساتھ قریش نے حرم قائم کیا — 20 میل محیط کا ایک حلقہ جس کا مرکز کعبہ تھا اور جہاں ہر قسم کی خون ریزی اور تشدد ممنوع تھا۔(13) انہوں نے بدو قبائل کے ساتھ خصوصی معاہدے کیے جنہوں نے وعدہ کیا کہ وہ تجارتی میلوں کے موسم کے دوران تجارتی قافلوں پر حملے نہیں کریں گے۔ بدلے میں ان بدو اتحادیوں کو تاجروں کے راہ نماؤں اور محافظوں کے طور پر عمل کرنے کی اجازت دی گئی تا کہ وہ آمدنی کا خسارہ پورا کرسکیں۔

چنانچہ مکہ میں تجارت اور مذہب ایک دوسرے میں رچے بسے ہوئے تھے۔ مکہ کا حج سوق چکر کا عروج تھا۔ قریش نے عبادت گاہ اور مسلک کو نئی تعبیر دی اور یہ تمام عرب قبائل کا روحانی مرکز بن گیا۔ تب بھی بدو دیوتاؤں میں زیادہ دلچسپی نہیں رکھتے تھے؛ ہر قبیلے کا اپنا اپنا سرپرست معبود تھا جس کی نمائندگی عموماً پتھر کی ایک شبیہ کرتی تھی۔ قریش نے اپنے ساتھ اتحاد میں شامل قبائل کے ٹوٹم جمع کیے اور انہیں حرم میں رکھا تا کہ قبائلی لوگ مکہ کی زیارت کے وقت اپنے اپنے سرپرست دیوتا کی پرستش کرسکیں۔ کعبہ کی حرمت قریش کی کامیابی اور بقا کے لیے ضروری تھی، اور ان کے حریف یہ بات جانتے تھے۔ زائرین اور کاروبار کو قریش کے ہاتھوں سے نکالنے کی خاطر ابائی سینیا اور یمن کے گورنر نے صفاء میں ایک مقابل حرم تعمیر کیا۔ تب 547ء میں وہ ایک فوج لے کر مکہ کی طرف آیا تا کہ یہ ثابت کرسکے کہ شہر جنگ وجدل سے پاک نہیں تھا۔ لیکن بتایا جاتا تھا کہ اس کے جنگی ہاتھی مکہ کے نواح میں پہنچ کر گھٹنوں کے بل گر گئے اور آگے بڑھنے سے انکار کر دیا۔ ابائی سینیوں نے یہ کرشمہ دیکھا تو واپسی کی راہ لی۔ ''ہاتھیوں کا سال'' (عام الفیل) مکہ کی حرمت کی علامت بن گیا۔(14)

لیکن مسلک تقدس کے خالی استحصال پر ہی مشتمل نہ تھا۔ حج کی رسوم نے بھی عرب زائرین کو ایک عمیق تجربہ دیا۔ سوق کے اختتام پر جب وہ مکہ میں جمع ہوتے تو کامیابی اور جوش کا ایک احساس موجزن ہوتا۔ قریش قافلوں کا معائنہ کرتے، اونٹوں سے سامان اتارا جاتا اور تاجر معمولی فیس ادا کرنے کے بعد اپنے خادموں کے ہمراہ حرم کی زیارت کرنے کے لیے آزاد ہوتے۔ نواحی بستیوں کی تنگ گلیوں میں سے گزرتے ہوئے وہ رسم کے مطابق اونچی آواز میں پکارتے،

دیوتاؤں کو اپنی حاضری دینے کے متعلق بتاتے۔ جزیرہ نما میں طویل مسافت کے بعد اپنے قبیلے کی مقدس علامات کے ساتھ یہ دوبارہ ملاقات ایک طرح کی وطن واپسی تھی۔ 360 قبائلی ٹوٹموں میں گھرے ہوئے کعبہ کے سامنے پہنچ کر وہ مکہ اور گرد و نواح میں رسوم ادا کرنے لگتے جن کا اصلی مقصد شاید موسم سرما کی بارشیں لانا ہوتا ہوگا۔ وہ صفا و مروہ کے درمیان سات مرتبہ دوڑتے (کعبہ کے مشرق میں)؛ مزدلفہ تک بصورت ہجوم بھاگتے جو رعد دیوتا کا گھر تھا؛ وہ شہر سے سولہ میل باہر کوہ عرفات کے قریب میدان میں ساری رات جاگتے ہوئے گزارتے؛ منیٰ کی وادی میں تین ستونوں کو کنکریاں مارتے، اور انجام کار رسم زیارت کے آخر میں اپنی نہایت قیمتی اونٹنیاں قربان کرتے۔ جو ان کی دولت اور لہٰذا اپنی قدر و قیمت کی بھی علامت تھیں۔

حج کا اہم ترین مرحلہ طواف تھا۔ کعبہ کے گرد گھڑی کے رخ پر سات چکر لگانا، عربیہ کے گرد گول تجارتی راستے کا ایک قسم کا سوانگ (اس نے عربوں کی تجارتی سرگرمیوں کو ایک روحانی جہت عطا کی)۔ طواف اظہار عقیدت کا ایک مقبول عام مرحلہ بن گیا اور شہری اپنے مہمانوں کے ہمراہ سارا سال یہ رسم انجام دیتے رہتے۔[15] چار نقاط اصلیہ کے نمائندہ چار کونوں والا کعبہ دنیا کی علامت تھا۔ اس کی مشرقی دیوار میں حجر اسود (کالا پتھر) نصب تھا۔ بسالٹ کا ایک ٹکڑا جو شہاب ثاقب کی صورت میں آسمان اور زمین کے درمیان رابطہ بناتے ہوئے گرا تھا۔ جب زائرین زمین کے گرد سورج کے راستے کی تقلید میں گرینائٹ پتھر سے بنے کعبہ کے گرد چکر لگاتے تو خود کو کائنات کے اساسی نظم کے ساتھ ہم آہنگ کر لیتے۔ دائرہ تکمیل یا کلیت کی عام علامت ہے اور طواف (جس میں آپ ایک مقام سے شروع ہو کر دوبارہ وہیں آتے ہیں) کا دستور باقاعدگی اور عہد در عہد تسلسل کا احساس جگاتا ہے۔ کعبہ کے گرد چکر لگانے کے ذریعے زائرین نے اپنا حقیقی رخ اور داخلی مرکز جانا؛ ہلکا ہلکا دوڑ کر طواف کرنے سے ان کے ذہن فالتو سوچوں سے پاک ہو جاتے اور وہ ایک زیادہ مراقباتی حالت میں داخل ہوتے۔

اصلاح یافتہ رسوم نے مکہ کو عرب کا محور بنا دیا۔ دیگر زائرین کو اپنے گھر بار چھوڑ کر دور دراز مقامات کا سفر کرنا پڑتا تھا، جبکہ عربوں کو جزیرہ نما سے باہر جانے کی ضرورت نہ تھی۔ ان سب چیزوں نے عرب دنیا کے مرکز و محور کے طور پر مکہ کی حیثیت پر مہر تصدیق ثبت کی۔[16] شہر کے الگ

تھلک ہونے کے باعث بھی عربوں کو ایک کمیاب آزادی میسر آئی۔ فارس اور نہ ہی بازنطین۔۔۔ خطے کی عظیم طاقتیں۔۔۔ کو عرب کے دشوار گزار علاقے میں کوئی دلچسپی تھی؛ چنانچہ قریش سامراجی کنٹرول کے بغیر ایک جدید معیشت تخلیق کرنے کے قابل ہوئے۔ دنیا مکہ سے ہو کر گزرتی تھی، لیکن اتنی دیر قیام نہ کرتی کہ وہاں کوئی مداخلت کر پاتی۔ عرب اپنی آئیڈیالوجی بنانے اور اپنے زیادہ مہذب پڑوسیوں کے علم اور مہارت کی من مانی تعبیر کرنے کے قابل تھے۔ ان پر ایک بیگانے مذہب کو قبول کرنے یا سرکاری عقائد سے مطابقت اختیار کرنے کے لیے کوئی دباؤ نہ تھا۔ تجارتی چکر اور حج کی رسوم دونوں کا بند چکر ان کی خود کفالتی کی فخر مندانہ علامت تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ خود کفالتی ان کی شہری ثقافت کا امتیازی نشان بن گئی۔

عظیم طاقتوں سے علیحدگی کا مطلب تھا کہ مکی معیشت کو ان کی خوشحالی کے زوال سے کوئی نقصان نہیں پہنچتا تھا۔ حضرت محمدؐ کے سن پیدائش 570ء میں فارس اور بازنطین باہم لڑائیوں کے سلسلے میں قید ہو چکے تھے جس کے باعث دونوں سلطنتیں مہلک حد تک کمزور ہو گئیں۔ شام اور میسو پوٹامیا میدان جنگ بنے، بہت سے تجارتی راستے ترک ہو گئے اور مکہ نے شمال اور جنوب کے درمیان ہونے والی تمام تجارت کا کنٹرول سنبھال لیا۔(17) قریش اور بھی زیادہ طاقتور ہوئے، مگر کچھ ایک لوگ محسوس کرنے لگے کہ وہ اپنی کامیابی کی بہت بھاری قیمت ادا کر رہے تھے۔ چھٹی صدی کے اختتام پر مکہ شہر روحانی اور اخلاقی بحران کی گرفت میں جکڑا ہوا تھا۔

منڈی کی معیشت نے پرانی قبائلی روح کی دھجیاں بکھیر دی تھیں جس کا دارومدار بے رحم مقابلہ بازی، حرص اور انفرادی کوشش پر تھا۔ اب خاندان دولت اور شان و شوکت کے لیے ایک دوسرے کے خلاف صف آراء ہو گئے۔ نسبتاً کم کامیاب قبیلچوں* نے محسوس کیا کہ انہیں دیوار کے ساتھ دھکیلا جا رہا ہے۔ لوگ اپنی دولت میں دوسروں کو فراخدلانہ طریقے سے حصہ دار بنانے کی بجائے خزانے جمع کر رہے تھے اور ذاتی جائیدادیں بنانے میں مصروف تھے۔ انہوں نے نہ صرف قبیلے کے غرباً کی حالت زار کو نظر انداز کر دیا، بلکہ یتیموں اور بیواؤں کے حقوق چھیننے، ان کی موروثی

*قبیلہ (Tribe) اور قبیلچہ (Clan) کے درمیان امتیاز کرنا کافی مشکل ہے۔ یہاں قبیلچہ کی اصطلاح کسی قبیلے کے ذیلی خاندانی گروپ کے لیے استعمال کی گئی ہے۔

املاک کو اپنی جائیداد میں شامل کر لیا۔ خوشحال لوگ اپنے نئے تحفظ پر مسرور تھے؛ انہیں یقین تھا کہ ان کی دولت نے انہیں بدوہ کی بے چارگی اور تکلیف سے بچا لیا ہے۔ لیکن مالی کامیابی کی اس بھگدڑ میں پیروں تلے روندے جانے والے لوگ مایوس اور فراموشی کا شکار تھے۔ مروۃ کے اصول منڈی کی قوتوں کے ساتھ غیر مطابق لگتے تھے، اور بہت سوں نے ایک روحانی قید محسوس کی۔ پرانے مثالی تصورات کی جگہ کوئی اتنی ہی اہم چیز نہیں آئی تھی، اور برادری کے رچے بسے دساتیر نے انہیں بتایا کہ یہ شدید انفرادیت پسندی قبیلے کو نقصان پہنچائے گی جو صرف اپنے ارکان کے مجتمع وسائل کے بل پر ہی زندہ رہ سکتا تھا۔

آنحضرتؐ کی ولادت قبیلہ بنو ہاشم میں ہوئی جو مکہ کے ممتاز ترین قبیلوں میں سے ایک تھا۔ آپؐ کے دادا عبدالمطلب شام اور یمن کے ساتھ خود مختار تجارت میں مشغول ہونے والے پہلے تاجر تھے اور قبیلے کو حج کے دوران زائرین کو پانی فراہم کرنے کی مراعات حاصل تھی۔ زمزم کی سقایت شہر میں اہم ترین فرائض میں شمار ہوتی تھی لیکن کچھ عرصہ سے بنو ہاشم سخت حالات کا شکار تھے۔ حضرت محمدؐ کے والد عبداللہ آپؐ کی پیدائش سے قبل ہی فوت ہو گئے اور والدہ حضرت آمنہ کے حالات اس قدر تنگ تھے کہ کہا جاتا تھا کہ عرب کے غریب ترین قبائل میں سے ایک کے ساتھ تعلق رکھنے والی خاتون ہی آنحضرتؐ کی دایا بننے پر آمادہ ہوئی۔ آپؐ چھ سال کی عمر تک حلیمہ سعدیہ کے پاس رہے اور خانہ بدوشی کی سخت گیر زندگی کا تجربہ کیا۔ مکہ واپس لائے جانے کے کچھ عرصہ بعد آنحضرتؐ کی والدہ انتقال فرما گئیں۔ اس دہرے صدمے نے آپؐ کی زندگی پر عمیق اثرات مرتب کیے؛ جیسا کہ ہم دیکھیں گے، آپؐ ہمیشہ یتیموں اور مساکین کے متعلق فکر مند رہے۔

دیگر عزیز و اقارب نے حضرت محمدؐ کے ساتھ پُر محبت سلوک کیا۔ پہلے آپؐ اپنے دادا حضرت عبدالمطلب کے پاس رہے جو اپنی جوانی میں ایک نہایت کامیاب تاجر ہوا کرتے تھے۔ دادا نے حضرت محمدؐ کو بہت عزیز رکھا۔ وہ ان کا بستر باہر لے جانا پسند کرتے تھے جہاں آپؐ کعبہ کے زیر سایہ، چچاؤں کے درمیان سو سکتے تھے۔ حضرت محمدؐ اپنے دادا کے ساتھ بیٹھتے اور دادا ان کی کمر کو محبت سے تھپتھپاتے رہتے۔ تاہم، آٹھ سال کی عمر میں دادا کا سایہ سر سے اٹھ جانے پر آنحضرتؐ

اپنے چچا ابو طالب کے پاس رہنے چلے گئے جو بنو ہاشم کے ''سید'' (سردار) اور مکہ میں ایک نہایت محترم شخصیت تھے۔ حالانکہ ان کا کاروبار انحطاط کا شکار تھا۔ حضرت ابو طالب نے اپنے بھتیجے سے بہت محبت کی اور ان کے بھائیوں نے بھی آنحضرتؐ کی تعلیم و تربیت میں مدد دی۔ سب سے چھوٹے اور زبردست طاقت کے مالک چچا حضرت حمزہؓ نے آپؐ کو فنونِ حرب سکھائے اور تیر اندازی و تلوار بازی کی تربیت دی۔ بینک کار چچا حضرت عباسؓ نے آپؐ کو شام جانے والے تجارتی قافلوں میں انتظامی ملازمت دلوائی۔

نوجوانی میں آپؐ مکہ میں ہر دلعزیز شخصیت بن چکے تھے۔ آپؐ خوبرو اور مناسب قد و قامت کے مالک تھے۔ آپؐ کے سر اور ریش کے بال گھنے اور لہریے دار تھے۔ آپؐ کا چہرہ پُر نور تاثر کا حامل اور مسکراہٹ مسحور کن تھی جس کا ذکر سبھی سوانح نگاروں نے کیا۔ آپؐ نے جو کام بھی کیا پوری ایمان داری کے ساتھ اور فیصلہ کن انداز میں کیا۔ آپؐ اپنے کام میں اس قدر محو ہوتے کہ کسی اور چیز کی پروا نہ کرتے۔ کسی سے بات کرتے وقت آپؐ اپنا پورا چہرہ اس کی جانب موڑتے اور واضح الفاظ استعمال کرتے۔ مصافحہ کرنے پر آپؐ ہمیشہ اپنا ہاتھ بعد میں واپس کھینچتے۔ آپؐ اس قدر معتبر تھے کہ ''الامین'' کہلانے لگے۔ آپؐ اپنی کزن فاختہ سے شادی کرنا چاہتے تھے لیکن حضرت ابو طالب نے رشتہ منظور نہ کیا اور شفقت سے کہا کہ آپؐ بیوی کی کفالت نہیں کر سکیں گے۔

لیکن جب آنحضرتؐ کی عمر چوبیس سال ہوئی تو قسمت نے پلٹا کھایا۔ دور کی رشتہ دار خاتون خدیجہؓ بنت الخویلد نے آپؐ کو اپنا ایک تجارتی قافلہ لے کر شام جانے کو کہا۔ حضرت خدیجہ کا تعلق بنو اسد سے تھا جو اب بنو ہاشم کی نسبت زیادہ با رسوخ بن چکا تھا۔ اپنے شوہر کی وفات کے بعد حضرت خدیجہؓ ایک کامیاب تاجر بن گئی تھیں۔ شہری زندگی اکثر اعلیٰ طبقے کی خواتین کو کاروباری کامیابی کا موقعہ دیتی تھی، البتہ کمتر طبقات کی عورتوں کو مکہ میں کوئی حیثیت حاصل نہ تھی۔ حضرت محمدؐ نے اپنے ذمہ لگایا گیا کام اس قدر احسن انداز میں انجام دیا کہ حضرت خدیجہؓ نے متاثر ہو کر آپؐ کو شادی کا پیغام بھیجا۔ انہیں ایک شوہر کی ضرورت تھی اور باصلاحیت رشتہ دار ایک موزوں انتخاب ثابت ہوئے۔ انہوں نے حضرت محمدؐ سے کہا: ''میں آپ کے ساتھ اپنے تعلق کی وجہ سے آپ کو پسند کرتی ہوں اور لوگوں میں آپ کی برتر شہرت، امانت داری، اچھے کردار اور صداقت بھی قابل

قدر ہے"۔[18] کچھ تنقید نگاروں نے دولت مند بیوہ کے ساتھ اس بروقت رشتے پر اعتراضات اٹھائے، لیکن یہ شادی موقعہ پرستی نہیں تھی۔ آنحضرتؐ نے حضرت خدیجہؓ کو بہت عزیز رکھا اور عرب میں کثیر الازدواجی مقبول عام ہونے کے باوجود ان کی زندگی میں دوسری شادی نہ کی۔ حضرت خدیجہؓ ایک زبردست خاتون تھیں۔"پرعزم، شریف اور ذہین" جیسا کہ ابن اسحٰق نے بیان کیا۔[19] سب سے پہلے حضرت خدیجہؓ نے ہی اپنے شوہر کا جوہرِ قابل شناخت کیا اور آپ کو جذباتی لحاظ سے اپنی عزیز زوجہ میں سہارا اور مدد میسر آئی۔ حضرت خدیجہؓ کی وفات کے بعد آپؐ اکثر دیگر ازواج سے ان کی تعریفیں کیا کرتے تھے۔

حضرت محمدؐ سے شادی کے وقت حضرت خدیجہؓ کی عمر تقریباً چالیس برس تھی۔ وہ آپؐ کے چھ بچوں کی ماں بنیں۔ دو بیٹے القاسم اور عبداللہ بچپن میں ہی فوت ہوگئے، لیکن آپؐ نے اپنی بیٹیوں زینبؓ، رقیہؓ، ام کلثومؓ اور فاطمہؓ الزہرۃ کو بہت عزیز رکھا۔ گھریلو زندگی پُرمسرت تھی، حالانکہ آپؐ اپنی آمدنی کا ایک بہت بڑا حصہ غریبوں کو دینے پر اصرار کرتے تھے۔ آپؐ نے دو غریب لڑکے بھی گود لیے۔ شادی کے دن حضرت خدیجہؓ نے آپؐ کو زید ابن الحارث نامی نوجوان غلام بطور تحفہ دیا جو شمالی قبائل سے تعلق رکھتا تھا۔ وہ آپؐ سے اس قدر مانوس ہوگیا کہ جب اس کے گھر والے فدیہ دے کر اسے لینے آئے تو زید نے اپنے آقا کے پاس ہی رہنے کی درخواست کی۔ آپ نے اسے آزاد کیا اور اپنے پاس ہی رکھ لیا۔ چند سال بعد مالی مشکلات سے دوچار حضرت ابوطالب کے بیٹے علیؓ کو بھی آپؐ نے اپنے گھر میں جگہ دی تاکہ چچا کا بوجھ کم کرسکیں۔ آپؐ نے دونوں بچوں سے اپنے بیٹوں جیسا سلوک کیا۔

ان ابتدائی برسوں کے متعلق ہم بہت کم معلومات رکھتے ہیں، لیکن بعد کے واقعات سے واضح ہو جاتا ہے کہ آنحضرتؐ نے جونوان نسل میں پیدا ہونے والی بے چینی کو بالکل درست طور پر شناخت کر لیا تھا۔ نوجوان لوگ منڈی کی معیشت سے تنگ آچکے تھے۔ قریش نے طبقاتی امتیازات متعارف کروائے تھے جو مروۃ کے مثالی تصور سے کوئی میل نہیں کھاتے تھے۔ مکہ کا کنٹرول حاصل کرنے کے بعد سے زیادہ دولت مند قریش کعبہ کے باہر آباد تھے، جبکہ کم خوشحال لوگ نواحی بستیوں اور شہر سے باہر پہاڑی علاقے میں رہتے تھے۔ انھوں نے فراخ دلی کی بدوی خصوصیت

ترک کر دی اور بخیل بن گئے، ماسوائے اس کے کہ وہ اسے کفایت شعارانہ کاروباری فراست کہتے تھے۔ کچھ لوگ اب پرانی تقدیر پرستی کو نہیں مانتے تھے کیونکہ انہیں اپنی قسمت بدلنے میں کامیابی حاصل ہوئی تھی۔ حتیٰ کہ انہیں یقین تھا کہ اپنی دولت انہیں ایک قسم کی لافانیت دے سکتی تھی۔[20] دیگر نے عیش پرستی کی زندگی اپنائی اور عیاشی کو ہی اپنا مذہب بنالیا۔[21] حضرت محمدؐ کو لگنے لگا کہ قریش نے مروۃ کے بہترین حصے کو چھوڑ دیا اور صرف بدترین پہلوؤں کو اپنائے رکھا تھا: بہیمیت، تکبر اور انا پرستی جو اخلاقی لحاظ سے تباہ کن تھی اور شہر کو تباہی سے دوچار کر سکتی تھی۔ آپؐ پوری طرح قائل ہو گئے کہ معاشرتی اصلاح کی بنیاد ایک نئے روحانی حل پر ہونی چاہیے، ورنہ وہ دیرپا نہیں ہوگی۔ غالبًا آپؐ نے بہت گہرائی میں محسوس کر لیا تھا کہ آپؐ غیر معمولی قابلیت کے مالک تھے، لیکن آپؐ کیا کر سکتے تھے؟ کوئی بھی آپؐ کی بات کو سنجیدگی سے نہ لیتا کیونکہ حضرت خدیجہؓ سے شادی کے باوجود شہر میں آپؐ کی کوئی حقیقی (مالی) وقعت نہ تھی۔

روحانی بے چینی ہر طرف چھائی ہوئی تھی۔ قصبات اور حجاز کی زرعی بستیوں میں آباد عربوں نے ایک مختلف کا مذہبی تصور وضع کر رکھا تھا۔ وہ دیوتاؤں میں بدو کی نسبت زیادہ دلچسپی رکھتے تھے، لیکن ان کی نامکمل الٰہیات کی جڑیں سرزمین عرب میں گہری نہیں تھیں۔ متعدد دیوتاؤں کے متعلق معدودے چند کہانیاں ہی سنائی جاتیں۔ اللہ اہم ترین دیوتا تھا اور اسے کعبہ کے آقا کی حیثیت میں تعظیم دی جاتی، لیکن وہ ایک بہت دور کی شخصیت تھا اور اسے لوگوں کی روزمرہ زندگی پر بہت کم اثر و رسوخ حاصل تھا۔ دیگر ''اعلیٰ دیوتاؤں'' یا ''آسمانی دیوتاؤں'' — جو قدیم مذہب کا عام عنصر تھے — کی طرح اللہ کا مسلک ترقی یافتہ نہیں تھا اور اس کی کوئی شبیہ بھی نہ بنائی گئی۔ ہر کوئی جانتا تھا کہ دنیا اللہ نے تخلیق کی تھی؛ کہ وہ کوکھ میں ہر انسانی جنین کو متحرک کرتا تھا؛ اور یہ کہ وہی بارش برسانے والا دیوتا تھا۔ لیکن یہ عقائد بدستور بہت تجریدی تھے۔ کبھی کبھار عرب ناگہانی صورت حال میں اللہ سے دعا مانگتے تھے، مگر خطرہ ٹل جانے پر وہ اسے بھول جاتے۔[23] درحقیقت اللہ ایک غیر ذمہ دار، غیر حاضر باپ جیسا تھا۔ مردوں اور عورتوں کو ہست میں لانے کے بعد وہ ان سے بے خبر ہو گیا اور انہیں ان کی تقدیر کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔[24]

قریش دیگر دیوتاؤں کی بھی پرستش کرتے تھے۔ ہبل نامی دیوتا موجود تھا — ایک سرخی مائل پتھر جو کعبہ کے اندر نصب کیا گیا تھا۔[25] تین دیویاں تھیں — لات، عزیٰ اور منات — جنہیں عموماً ''بنات اللہ'' یعنی اللہ کی بیٹیاں کہا جاتا۔ مستقل بستیوں میں یہ دیویاں بہت مقبول تھیں۔ طائف، نخلہ اور قضید میں ان کے معبدوں میں بڑے بڑے پتھر ان کی نمائندگی کرتے تھے۔ یہ معبد مکہ کے حرم سے ملتے جلتے تھے۔ اللہ سے کمتر رُتبے کی مالک ہونے کے باوجود انہیں عموماً اللہ کی ''ساتھی'' یا شریک کہا جاتا اور ان کا موازنہ ''غرانیق'' (خوبصورت بگلے) سے کیا جاتا جو کسی بھی اور پرندے سے زیادہ بلندی پر پرواز کرتے تھے۔ مکہ میں ان دیویوں کی کوئی عبادت گاہ موجود نہ ہونے کے باوجود قریش ان سے محبت کرتے اور انہی کے توسط سے ناقابل رسائی اللہ تک درخواستیں بھیجتے تھے۔ کعبہ کے گرد طواف کرتے ہوئے وہ عموماً یہ الفاظ پکارتے: ''لات، عزیٰ اور منات۔ یقیناً یہ رفیع الشان غرانیق ہیں۔ ہم امید کرتے ہیں کہ وہ ہماری سفارش کریں گی۔''[26]

یہ نئی بت پرستی ایک نسبتاً نیا مذہبی جوش تھی جسے مکہ کے بزرگوں میں سے ایک نے شام سے درآمد کیا جو یقین رکھتا تھا کہ وہ بارش لا سکتے ہیں، لیکن ہمیں اس بارے میں معلوم نہیں کہ مثلاً ان دیویوں کو بنات اللہ کیوں کہا جاتا تھا — بالکل اس امر کے پیش نظر کہ عرب لوگ بیٹی کی پیدائش کو بدقسمتی سمجھتے اور انہیں پیدا ہوتے ہی مار ڈالتے تھے۔ عرب کے دیوتاؤں نے اپنے پجاریوں کو کوئی اخلاقی راہنمائی نہ دی۔ کچھ قریش رسوم کو روحانی طور پر تسکین بخش خیال کرنے کے باوجود ان بتوں کو الوہیت کی ناکافی علامات سمجھنے لگے تھے۔[27]

لیکن متبادل کیا تھا؟ عرب یہودیت اور عیسائیت کے وحدانیت پرست مذاہب سے واقف تھے۔ یہودی کوئی ایک ہزار سال سے عربیہ میں آباد تھے؛ وہ فلسطین پر بابلی اور رومن حملے کے بعد ہجرت کر کے یہاں آئے تھے۔ یہودی سب سے پہلے شمال کی زرعی بستیوں یثرب اور خیبر میں مقیم ہوئے قصبات میں یہودی تاجر اور سٹیپیوں میں یہودی خانہ بدوش موجود تھے۔ انہوں نے اپنا مذہب قائم رکھا، اپنے علیحدہ قبیلے بنائے، لیکن مقامی لوگوں کے ساتھ شادیاں کیں اور اب عملاً عربوں سے قابل تمیز نہیں رہے تھے۔ وہ عربی زبان بولتے، انہوں نے عرب نام رکھے اور اپنے معاشرے کو عرب پڑوسیوں کے نمونے پر منظم کیا۔ کچھ ایک عرب عیسائی بن گئے تھے: یمن میں اور

بازنطینی سرحد کے ساتھ ساتھ اہم عیسائی بستیاں موجود تھیں۔ مکی تاجروں نے اپنے اسفار کے دوران عیسائی راہبوں اور مرتاضوں سے ملاقاتیں کی تھیں اور یسوع مسیح کی کہانیوں کے علاوہ بہشت اور روز قیامت کے تصورات سے بھی واقف تھے۔ وہ یہودیوں اور عیسائیوں کو ''اہل الکتاب'' کہا کرتے تھے۔ وہ الہامی کتاب کے تصور کو سراہتے اور خواہش رکھتے تھے کہ ان کے پاس اپنی زبان میں اپنا صحیفہ ہو۔

لیکن اس دور میں عرب یہودیت اور عیسائیت کو دو جداگانہ روایات نہیں سمجھتے تھے جو ان کی اپنی روایت سے اساسی طور پر مختلف ہوتیں۔ درحقیقت لفظ ''یہودی'' یا ''عیسائی'' سے عموماً مذہبی رجحان کی بجائے ایک قبائلی وابستگی مراد ہوتی تھی۔[28] یہ عقائد جزیرہ نما کے روحانی منظر نامے کا قبول شدہ جزو تھے اور انہیں عرب روحانیت کے ساتھ ہم آہنگ خیال کیا جاتا تھا۔ چونکہ کوئی بھی استعماری (شہنشاہی) طاقت مذہبی راسخ العقیدگی کی کوئی بھی صورت نافذ کرنے کی جستجو میں نہیں تھی، اس لیے عربوں نے ان روایات کو اپنی ضرورت کے مطابق ڈھالنے میں کوئی عار محسوس نہ کی۔ وہ یقین رکھتے تھے کہ یہودی اور عیسائی ایک خدا اللہ کی ہی عبادت کرتے ہیں، چنانچہ عیسائی بھی بت پرستوں کے ہمراہ اللہ کے گھر کعبہ کا حج کرتے۔ کہا جاتا تھا کہ حضرت آدمؑ نے بہشت بدری کے بعد کعبہ تعمیر کیا تھا اور حضرت نوحؑ نے طوفان عظیم کے بعد اسے دوبارہ بنایا تھا۔ قریش جانتے تھے کہ بائبل میں عربوں کو حضرت ابراہیمؑ کے بڑے بیٹے حضرت اسماعیلؑ کی اولاد بتایا گیا تھا، اور یہ کہ خدا نے ابراہیمؑ کو حکم دیا تھا کہ اسماعیلؑ اور ان کی ماں ہاجرہ کو ویرانے میں نکال دے، اور ساتھ ہی وعدہ کیا کہ وہ ان کی اولادوں کی ایک بہت بڑی قوم بنائے گا۔[29] بعد ازاں حضرت ابراہیمؑ خواب میں حضرت ہاجرہ اور حضرت اسمٰعیلؑ سے ملنے آئے اور زیارت گاہ کی دریافت نو کی۔ حضرت ابراہیمؑ اور اسمٰعیلؑ نے اسے ایک مرتبہ پھر تعمیر کیا اور حج کی رسوم وضع کیں۔

ہر کوئی جانتا تھا کہ عرب اور یہودی قرابت دار تھے۔ جیسا کہ یہودی مورخ جوزیفس (37 تا 100ء) نے وضاحت کی، عرب پندرہ سال کی عمر میں اپنے بیٹوں کے ختنے کرتے تھے ''کیونکہ ان کی قوم کے بانی حضرت اسمٰعیلؑ (جو حضرت ابراہیمؑ کی لونڈی حضرت ہاجرہ کے بطن سے پیدا ہوئے) کے ختنے اسی عمر میں ہوئے تھے۔''[30] عربوں نے یہودیت یا عیسائیت اختیار

کرنا ضروری محسوس نہ کیا کیونکہ وہ یقین رکھتے تھے کہ وہ پہلے سے ہی خاندان ابراہیمیؑ کے ارکان تھے؛ درحقیقت قریش ایک عقیدہ چھوڑ کر دوسرا اپنانے کے تصور سے نابلد تھے؛ ان کا تصور مذہب بنیادی طور پر کثرت پرستانہ تھا۔[31] ہر قبیلہ اپنے اپنے دیوتا کی پرستش کرنے مکہ آتا جو حرم میں بیت اللہ کے ساتھ استادہ تھا۔ عرب عقائد کے ایک بند نظام کے تصور کا ادراک نہیں رکھتے تھے، اور نہ ہی انہوں نے وحدانیت کو کثرت پرستی کے ساتھ عدم مطابقت کا حامل سمجھا۔ انہوں نے کعبہ میں بتوں کے حلقے میں گھرے ہوئے اللہ کو دیوتاؤں کے لشکر کا قائد قرار دیا، بالکل اسی طرح جیسے کچھ بائبلی مصنفین نے یہواہ کو دیگر تمام ''دیوتاؤں سے بالاتر'' خیال کیا تھا۔[32]

لیکن مستقل طور پر سکونت پذیر کچھ عرب اس بت پرستانہ کثرت پرستی سے غیر مطمئن ہو رہے تھے، اور وہ ایک د۔ی، عربی وحدانیت تخلیق کرنے کی کوشش میں تھی۔[33] پہلی وحی موصول ہونے کے کچھ ہی عرصہ بعد آنحضرتؐ حرم کی مذہبی زندگی سے الگ ہو گئے۔ آپؐ نے اپنے قبیلے والوں کو بتایا کہ حجرِ اسود کے گرد چکر لگانا بے معنی تھا جو کچھ دیکھنے، سننے، نقصان پہنچانے یا مدد کرنے سے عاری تھا۔ ''انہیں یقین تھا کہ عربوں نے ''اپنے جدِ امجد حضرت ابراہیمؑ کے مذہب کو بگاڑ دیا تھا'' لہٰذا وہ ان کے ''خالص مذہب'' حنیفیہ کو کھوجنے جا رہے تھے۔[34] یہ ایک منظم فرقہ نہیں تھا۔ سب حنیفیوں نے پتھر کی شبیہوں کی پرستش سے بیزاری ظاہر کی اور یقین رکھتے تھے کہ اللہ واحد خدا تھا، لیکن سبھی نے اس عقیدے کی تفسیر ایک ہی انداز میں نہ کی۔ کچھ کو امید تھی کہ ایک عرب پیغمبر دین ابراہیمی کو بحال کرنے کے لیے الوہی مشن لے کر آئے گا؛ دیگر نے سوچا کہ یہ چیز غیر ضروری تھی: لوگ اگر خود چاہتے تو حنیفیہ کی جانب واپس جا سکتے تھے؛ کچھ نے حشر اجساد اور روز قیامت کا پرچار کیا؛ دیگر نے دین ابراہیمؑ قائم ہو جانے تک عبوری اقدام کے طور پر عیسائیت یا یہودیت قبول کر لی۔

حنفی اپنے معاصرین پر بہت کم اثر و رسوخ رکھتے تھے، کیونکہ ان کی توجہ کا مرکز ذاتی نجات تھی، انہیں عرب کی سماجی یا اخلاقی زندگی میں اصلاح لانے کی کوئی خواہش نہ تھی اور الٰہیات بنیادی طور پر منفی تھی۔ وہ کوئی نئی چیز تخلیق کرنے کی بجائے محض مرکزی دھارے سے الگ ہو گئے۔ درحقیقت حنیف کا مادہ حنف ہے یعنی ''منہ موڑ لینا۔'' وہ اپنی منزل کے ایک اثباتی تصور سے زیادہ

یہ سلبی تصور رکھتے تھے کہ انہیں کیا نہیں چاہیے تھا؛ لیکن یہ تحریک ساتویں صدی کے آغاز پر عرب میں روحانی کاہلی کی علامت تھی، اور ہم جانتے ہیں کہ حضرت محمدؐ مکہ کے تینوں سرکردہ حنیفیوں سے قریبی روابط رکھتے تھے۔ عبیداللہ ابن جحش آپؐ کا کزن اور ورقہ بن نوفل (حضرت خدیجہؓ کا کزن)؛ یہ دونوں حضرات عیسائی ہوگئے تھے۔ زید ابن عمرو کا بھتیجا (جو مکہ کے بت پرست مذہب پر شدید تنقید کرنے کے باعث شہر بدر ہوا) حضرت محمدؐ کے قریب ترین پیروکاروں میں شامل ہوا۔ چنانچہ لگتا ہے کہ آپؐ حنفی حلقوں میں میل جول رکھتے تھے اور شاید زید ہی کی طرح الوہی راہنمائی کے متمنی ہوں گے۔ مکہ سے نکالے جانے سے ایک روز قبل زید نے کعبہ کے قریب کھڑے ہوکر حرم کے بگڑے ہوئے مذہب کے متعلق شکایت کی، لیکن اچانک وہ بول اٹھا: ''اے اللہ! اگر میں جانتا کہ تو کس انداز میں اپنی عبادت کیے جانے کا خواہش مند ہے تو میں تیری عبادت کرتا۔ لیکن مجھے وہ انداز معلوم نہیں۔''[35]

حضرت محمدؐ ایک نئے حل کے متلاشی تھے۔ کچھ برس تک حضرت خدیجہؓ کے ہمراہ آپؐ ماہ رمضان میں کوہ حرا پر جاتے اور ان غرباء میں خیرات تقسیم کرتے جو غارِ حرا میں آپؐ سے ملنے آیا کرتے تھے۔[36] ہمیں ان دساتیر کے متعلق بہت کم معلومات میسر ہیں۔ کچھ اسناد کے مطابق ان کا رواج حضرت عبدالمطلب نے ڈالا تھا۔ لگتا ہے کہ ان میں سماجی فکر مندی اور رسوم کو ملا دیا گیا جن میں اللہ کے سامنے سجدہ ریز ہونا[37] بھی شامل ہوگا اور کعبہ کا پُر جوش طواف بھی۔ اس دور میں حضرت محمدؐ رویتیں بھی دیکھنے لگے جو ''صبح کے اجالے کی طرح آپؐ پر وارد ہوتیں — عربی زبان کا ایک محاورہ جو سورج نکلنے پر تاریکی دور ہونے کا اظہار کرتا ہے۔[38] کوہِ حرا میں اپنی سالانہ عزلت نشینی کے ایک موقعہ پر ہی، تقریباً 610ء میں آپؐ نے حیرت انگیز اور مسحور کن تجربہ کیا۔ آپؐ کو اپنی ہستی کی گہرائیوں میں سے نچڑ کر آتے محسوس ہونے والے الفاظ مکہ میں مسئلے کی جڑ سے تعلق رکھتے تھے۔

پڑھ اپنے رب کے نام سے جو سب کا خالق ہے

بنایا آدمی کو جمے ہوئے لہو سے

پڑھ اور تیرا رب کریم ہے

جس نے علم سکھایا قلم سے

سکھلایا آدمی کو جو وہ نہ جانتا تھا

کوئی نہیں آدمی سر چڑھتا ہے اس سے

کہ دیکھے اپنے آپ کو بے پروا

بے شک تیرے رب کی طرف واپس جانا ہے۔

یہ آیت قریش کو اپنے اس عقیدے کی توسیع معلوم ہوئی کہ ان میں سے ہر ایک کو اللہ نے تخلیق کیا تھا۔ اس میں مروۃ کی خود انحصاری کو ایک دھوکا قرار دیا گیا، کیونکہ انسان مکمل طور پر خدا پر انحصار رکھتے تھے۔ آخر میں اللہ نے اصرار کیا کہ وہ ایک الگ تھلگ، غیر حاضر معبود نہیں بلکہ اپنی مخلوق کو رشد و ہدایت کرتا ہے تاکہ وہ اس کے ''قریب'' آسکیں۔ لیکن ایک پرغرور استغنا کے ساتھ خدا کی جانب جانے کی بجائے انہیں کسی حقیر غلام کی طرح اس کے سامنے سر جھکانا تھا: خدا نے حکم دیا، ''اپنا سر زمین سے چھوؤ!'' پرغرور قریش کی نظر میں ایسا کرنا باعث تحقیر تھا۔ بہت ابتداً سے ہی حضرت محمدؐ کا مذہب مروۃ کے کچھ اساسی اصولوں سے عین متضاد تھا۔

حواس بحال ہونے پر آپؐ نہایت خوف زدہ ہوئے۔ آپؐ نے سوچا کسی جن نے حملہ کیا ہے، اور اپنی زندگی سے مایوس ہو گئے۔ اسی مایوسی کے عالم میں آپؐ غار سے باہر نکلے اور پہاڑی کی چوٹی کی جانب چڑھنے لگے۔ لیکن تب ایک اور رویا دیکھا۔ ایک مہیب ہستی نے افق پر غلبہ پالیا اور ''آگے یا پیچھے کوئی حرکت کیے بغیر آپؐ کو دیکھتی رہی۔''[40] آپؐ نے واپس مڑنا چاہا، لیکن بعد میں بتایا: ''میں آسمان پر جس طرف بھی نگاہ ڈالتا وہی ہستی سامنے ہوتی۔''[41] یہ الہام کی روح تھی جسے آپؐ نے جبرائیل کہا۔ لیکن یہ کوئی عام فطرت پسندانہ فرشتہ نہیں بلکہ ایک ماورائی موجودگی تھی جسے عام انسانی اور مکانی حدود میں رکھ کر نہیں دیکھا جا سکتا۔

ہنوز خوف اور بے یقینی کے عالم میں آپؐ پہاڑی سے نیچے اترے اور حضرت خدیجہؓ کے پاس گئے۔ آپؐ بری طرح کانپ اور لرز رہے تھے۔ آپؐ نے حضرت خدیجہؓ کی گود میں سر رکھتے ہوئے کہا، ''مجھے چادر اوڑھا دو!'' حضرت خدیجہؓ نے آپؐ کو ایک چُغے میں لپیٹا اور اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا، یہاں تک کہ آپؐ کا خوف دور ہو گیا۔ حضرت خدیجہؓ کو وحی کے متعلق شبہ نہ تھا۔ انہوں

نے اصرار کیا کہ یہ کوئی جن نہیں ہو سکتا تھا۔ خدا کسی ایسے شخص کے ساتھ یہ ظالمانہ حرکت نہیں کر سکتا تھا جو نہایت ایمان داری سے اس کی خدمت میں لگا ہوا تھا۔ حضرت خدیجہؓ نے آپ کو یاد دلایا، ''آپ اپنے عزیز و اقارب پر مہربان ہیں۔ آپ غربا و مساکین کا خیال رکھتے اور ان کا بوجھ اٹھاتے ہیں۔ آپ وہ اخلاقی فضائل بحال کرنے کے لیے کوشاں ہیں جو آپؐ کے لوگ کھو چکے ہیں۔ آپ مہمانوں کی عزت کرتے اور بے کسوں کی مدد کرنے جاتے ہیں۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔''(42) حضرت محمدؐ اور حضرت خدیجہؓ نے غالباً ایک مذہب کی حقیقی فطرت کی ابھرتی ہوئی تفہیم پر گفتگو کی جو رسوم کی ادائیگی سے ماوراء اور عملی ہمدردی اور پیہم اخلاقی کوشش کا متقاضی تھا۔

آنحضرتؐ کو تسلی دینے کی خاطر حضرت خدیجہؓ نے اپنے حنفی کزن ورقہ بن نوفل سے مشورہ کیا جو اہل الکتاب کے صحائف کا مطالعہ کر چکا تھا اور ماہرانہ رائے دے سکتا تھا۔ ورقہ بن نوفل بہت خوش ہوا اور کہنے لگا، ''اے خدیجہؓ! اگر تم نے مجھے سچ بتایا ہے تو ان پر بھی وہی الوہیت وارد ہوئی ہے جو ماضی میں موسیٰ پر ہوئی تھی، اور دیکھو، محمدؐ اپنے لوگوں کے پیغمبر ہیں۔''(43) اگلی مرتبہ جب ورقہ بن نوفل حرم میں آنحضرتؐ سے ملا تو آپ کی پیشانی پر بوسہ دیا اور خبردار کیا کہ آپ کا کام آسان نہیں ہوگا۔ ورقہ ایک ضعیف آدمی تھا اور اس کی زندگی زیادہ باقی نہیں تھی، لیکن اس نے خواہش ظاہر کی کہ جب قریش آپؐ کو شہر سے نکال دیں گے تو وہ آپ کی مدد کر سکے۔ حضرت محمدؐ کو تشویش ہوئی۔ آپؐ مکہ سے باہر زندگی کا تصور نہیں کر سکتے تھے۔ ورقہ نے بڑی آزردگی کے ساتھ آپؐ کو بتایا کہ پیغمبروں کو ہمیشہ ان کے وطن میں بے آبرو ہونا پڑا تھا۔

یہ ایک جان جوکھم میں ڈالنے والا اور خطرات سے لبریز آغاز تھا۔ تاہم، غارِ حرا میں تجربے کا ایک اور بیان بھی قرآن میں محفوظ ہے جہاں فرشتے کے نزول کو ایک حیرت انگیز اور باعث طمانیت واقعہ بتایا گیا:

ہم نے اس کو اتارا شب قدر میں

اور تُو نے کیا سمجھا ہے کہ کیا ہے شب قدر؟

شب قدر بہتر ہے ہزار مہینے سے

اترتے ہیں فرشتے اور روح اس میں

اپنے رب کے حکم سے ہر کام پر

امان ہے وہ رات صبح نکلنے تک۔[45]

قرآن کی اس سورۃ میں تذکیر و تانیث کا قابلِ غور ابہام موجود ہے (بالخصوص Pronouns میں) جسے عموماً ترجمے میں نظر انداز کر دیا گیا۔ قرآن میں ''تو نے کیا سمجھا ہے؟'' کا سوال متواتر ایک نیا تصور متعارف کرواتا ہے جو حضرت محمدؐ کے ابتدائی سامعین کو عجیب لگا ہوگا۔ یہ سوال اشارہ کرتا ہے کہ وہ لوگ ناقابل بیان کی اقلیم میں داخل ہونے والے تھے۔ اس سورۃ میں کوہِ حرا والے قصے کا ذکر نہیں اور لیلہ (رات) کو مرکزی حیثیت حاصل ہوگئی، جیسے کوئی عورت اپنے محبوب کا انتظار کرتی ہے۔ لیلۃ القدر نے آسمان اور زمین کے درمیان رابطے کا ایک نیا عہد شروع کیا تھا۔ الوہی ملاقات کی دہشت کی جگہ ایک راحت نے لے لی جو پو پھٹنے کی منتظر دنیا میں تاریکی کی طرح پھیلی ہوئی تھی۔

جرمن مؤرخ رڈولف اوٹو نے مقدس ذات کو ایک سرِ نہاں بتایا جو *tremendum* (ذی جلال) اور *fascinans* (مسحور کن) بھی تھی۔ یہ غالب آ جانے والی، براہ راست اور دہشت ناک تھی، لیکن یہ انسانوں کو ''خوشی، مسرت اور ہم آہنگی و قربت کے احساس'' سے بھی بھر دیتی تھی۔[46] الہام کو سیدھے سادے الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا، اور اپنے تجربے کی پیچیدگی نے آنحضرتؐ کو اس بارے میں بات کرنے کے حوالے سے نہایت محتاط بنا دیا۔ کوہِ حرا والے تجربے کے بعد مزید رویا پیش آئے — ہمیں ان کی درست تعداد معلوم نہیں — پھر الوہی آواز خاموش ہوگئی؛ مزید وحی نہ آئی۔

یہ بڑی مایوسی کا دور تھا۔ کیا آپؐ کے ساتھ دھوکا ہوا تھا؟ کیا ظاہر ہونے والی ہستی محض ایک شریر جن تھا؟ یا کیا خدا نے آپؐ سے منہ موڑ لیا تھا؟ دو سال تک آسمان کے دروازے بند رہے اور پھر اچانک ایک پُرنور یقین دہانی نے تاریکی دور کر دی:

قسم دھوپ چڑھتے وقت کی

اور رات کی جب چھا جائے

نہ رخصت کر دیا تجھ کو تیرے رب نے

اور نہ بیزار ہوا

اور البتہ پچھلی بہتر ہے تجھ کو پہلی سے

اور آگے دے گا تجھ کو تیرا رب

پھر تُو راضی ہوگا

بھلا نہیں پایا تجھ کو یتیم

پھر جگہ دی اور پایا تجھ کو بھٹکتا

پھر راہ سجھائی

اور پایا تجھ کو مفلس پھر بے پروا کر دیا

سو جو یتیم ہو اس کو مت دباؤ

اور جو مانگتا ہو اس کو مت جھڑکو

اور جو احسان تیرے رب کا ہے

سو بیان کر۔(47)

یہاں اللہ نے تسلی دی ہے کہ وہ اپنی مخلوق سے غافل نہیں ہوا، اور مردوں و عورتوں کو اپنی متواتر رحمت اور فیاضی کی مثال پر عمل کرنے کی یاد دِہانی کروائی ہے۔ خدا کی نگہبانی کا تجربہ کرنے والے انسانوں کا فرض تھا کہ وہ یتیموں اور بے کسوں کی مدد کریں۔ بے کسی، بھوک اور ظلم سہنے والے شخص کے لیے لازمی تھا کہ وہ دوسروں کو یہ تکالیف پہنچانے سے بہر صورت گریز کرے۔ وحی کا اختتام آنحضرتؐ کو یہ بتانے کے ساتھ ہوا کہ اب قریش کے سامنے اس پیغام کا اعلان کرنے کا موقع آ گیا تھا۔ لیکن وہ کیا ردِ عمل دیتے؟

باب 2

جاہلیہ

حضرت محمدؐ نے اپنا مشن خاموشی سے شروع کیا۔ آپؐ نے وحی کے متعلق دوستوں اور خاندان والوں کو بتایا جو پُر جوش اور ہمدرد شاگرد بن گئے۔ انہیں یقین تھا کہ حضرت محمدؐ ہی وہ عرب پیغمبر ہیں جس کا طویل عرصے سے انتظار تھا؛ لیکن آپؐ نے محسوس کیا کہ زیادہ تر قریش کے لیے یہ چیز قبول کرنا ناممکن تھا۔ اللہ کے تمام پیغمبر دراز قامت شخصیات، معاشرے کے بانی مبانی ہوا کرتے تھے۔ کچھ ایک نے تو معجزات بھی دکھائے۔ آنحضرتؐ حضرت موسیٰؑ یا حضرت عیسیٰؑ کے ہم پلہ کیسے ہو سکتے تھے؟ قریش نے آپؐ کو جوان ہوتے دیکھا تھا؛ انہوں نے آپ کو بازار میں کاروبار کرتے، باقی سب لوگوں کی طرح کھاتے پیتے بھی دیکھا تھا۔ انہوں نے مروۃ کی بہت ہی اقدار کو ترک کر دیا تھا، لیکن اس کا اشرافی / ارسٹوکریٹک نکتۂ نظر برقرار رکھا؛ اور وہ توقع رکھتے تھے کہ خدا کھاتے پیتے اور امیر قبائل میں سے ہی کریم کو منتخب کرے گا، نہ کہ بنو ہاشم کے غیر اہم رکن کو۔ جب آنحضرتؐ

نے انہیں اجداد کی سنت سے متضاد اندازِ حیات چھوڑنے کو کہا تو وہ کیا ردِعمل دیتے؟

اس ابتدائی مرحلے پر بھی حضرت محمدؐ کو مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ حضرت خدیجہؓ، آپؐ کی بیٹیوں، حضرت علیؓ اور زیدؓ نے آپؐ کے نئے رتبے کو غیر مشروط طور پر تسلیم کرلیا، لیکن چچا ابو طالب اپنی مدد اور محبت جاری رکھنے کے باوجود اس امر پر تکلیف میں مبتلا تھے کہ پیارے بھتیجے نے اجداد کی روش سے انحراف کیا تھا۔ خاندان میں اختلاف رائے پیدا ہوا۔ آپؐ کے چچازاد جعفرؓ ابن ابی طالب، عبداللہؓ اور عبیداللہ ابن جحشؓ اور ان کی بہن زینبؓ سبھی نے وحی کو قبول کیا، لیکن چچا عباس اور حمزہ گریزاں رہے (اگرچہ ان کی بیویاں مان گئیں)۔ آنحضرتؐ کی بیٹی زینبؓ کے شوہر ابو العاص نے نئے مذہب پر سوچ بچار کرنے سے بھی انکار کردیا۔ خاندانی اتحاد ایک مقدس قدر تھا، اور کسی بھی عرب کی طرح آنحضرتؐ اپنے قبیلے اور اس کے بزرگوں کا احترام کرتے تھے۔ انہیں قیادت بزرگوں کی جانب سے ملنے کی توقع تھی، لیکن نوجوان نسل نے آپؐ کے پیغام پر لبیک کہا۔ سلسلۂ وحی پہلے ہی آپؐ کو قبول شدہ دستور سے منحرف کرچکا تھا۔ آپؐ یہ غور کیے بغیر نہ رہ سکے کہ زیادہ تر پیروکاروں کا تعلق پست طبقات سے تھا۔ عورتیں کافی تعداد میں تھیں، دیگر آزاد شدہ غلام، خادم اور غلام تھے۔ غلاموں میں نہایت بلند آواز والے ابائی سینیائی حضرت بلالؓ نمایاں تھے۔ جب مسلمان حرم میں عبادت کرنے کے لیے اکٹھے ہوئے تو آپؐ نے خود کو "نوجوانوں اور شہر کے کمزور لوگوں" کے درمیان پایا۔[1] آپؐ نے انہیں اپنی چھوٹی سی جماعت میں خوش آمدید کہا، لیکن یقیناً سوچا ہوگا کہ ان غیر اہم لوگوں کی تحریک کامیاب کیسے ہوسکتی تھی۔ درحقیقت، قریش کے کچھ بزرگ (جنہیں ابھی تک آیات کے متعلق کچھ بھی معلوم نہ تھا) آپؐ سے ان لوگوں کی سنگت اختیار کرنے کے متعلق سوالات کرنے لگے تھے۔

سبھی "کمزور" لوگ پست اور کمتر نہ تھے؛ یہ تیکنیکی قبائلی اصطلاح غربت کی بجائے قبائلی حیثیت کی جانب اشارہ کرتی تھی۔ اس موقعہ پر حضرت محمدؐ کے پُرجوش ترین پیروکار اور قریبی رفیق عتیق ابن عثمان تھے جنہیں ان کی کنیت ابو بکرؓ سے جانا جاتا ہے۔ ابو بکرؓ بارسوخ اور خوش وضع تھے۔ ابن اسحٰق ہمیں بتاتا ہے کہ وہ ایک مشفق، قابل رسائی آدمی اور تعبیر الرویا کے خصوصی ماہر تھے۔[2] مکہ کی جارحانہ سرمایہ داری سے خائف بہت سے نوجوان ان کے پاس مشورہ کرنے آتے۔ کچھ

نوجوانوں نے نجی مصیبت اور ڈپریشن محسوس کیا اور اپنے والدین سے بیگانے ہو گئے تھے۔ ایک اہم سرمایہ کار کے بیٹے نے خواب میں دیکھا کہ اس کا باپ اسے آگ سے بھری ہوئی ایک کھائی میں دھکیل رہا تھا؛ تب اس نے محسوس کیا کہ دو ہاتھوں نے اسے تھام لیا تھا اور آنکھ کھلنے پر اسے لگا کہ بچانے والی ذات حضرت محمدؐ کی تھی۔[3] عبد شمس کے موقر قبیلے سے تعلق رکھنے والا ایک اور نوجوان ایک خواب دیکھنے کے بعد حضرت ابوبکرؓ کے پاس آیا۔ اس نے خواب میں دیکھا تھا کہ صحرا میں ایک آواز گونج رہی تھی، ''بادیہ نشینو، جاگو!'' آواز نے مکہ میں ایک پیغمبر کے ظہور کا اعلان بھی کیا۔[4] یہ دونوں نوجوان مسلمان ہو گئے، لیکن اول الذکر نے اپنا نیا عقیدہ باپ سے ہر ممکن حد تک مخفی رکھا، اور موخر الذکر کی تبدیلیٔ مذہب نے قبیلے کے بزرگوں کو سخت ناراض کیا، جو مکہ میں نہایت بارسوخ افراد میں شامل تھے۔

آیات نے شہر میں ایک نقص کو اجاگر کیا تھا۔ گزشتہ برسوں کے دوران جوانوں اور بوڑھوں، امیر اور غریب، مردوں اور عورتوں کے درمیان ایک پریشان کن دراڑ پیدا ہو گئی تھی۔ یہ خطرناک تھی۔ حضرت محمدؐ پر آیت در آیت، سورۃ بہ سورۃ نازل ہونے والے صحیفے نے اس قسم کی نابرابری کو برا کہا؛ ایک دھڑے کا دوسرے دھڑے کے ہاتھوں نقصان اٹھانا ناگزیر تھا۔[5] اپنے ہی خلاف صف آراء معاشرہ تباہ ہو جاتا، کیونکہ یہ چیزوں کی فطرت کے خلاف جا رہا تھا۔ یہ ایک خوف ناک دور تھا۔ فارس اور بازنطین کے مابین متواتر لڑائیاں پرانے عالمی نظام کے خاتمے کی نقیب معلوم ہوتی تھیں، اور حتیٰ کہ عرب کے اندر قبائلی جنگ و جدل تشویش ناک حد تک پہنچ چکی تھی۔ گزشتہ بیس برس کے دوران غزو (جو روایت کے مطابق مختصر المدت ہوا کرتا تھا) بے مثال خشک سالی اور قحط کے نتیجے میں طویل المدت عسکری مہمات کی شکل اختیار کر گیا۔ پیش آمدہ تباہی و بربادی کا ایک احساس عرب کو اپنی گرفت میں لیے ہوئے تھا۔ حضرت محمدؐ پوری طرح قائل تھے کہ اگر قریش نے اپنے طور طریقے بہتر نہ بنائے تو وہ بھی دنیا کے سر پہ تلوار کی طرح لٹکتی ہوئی انارکی (نراجیت) کا شکار ہو جائیں گے۔

اللہ سے القا یافتہ حضرت محمدؐ نے ایک قطعی نئے حل کی جانب راہ تلاش کرنا شروع کی۔ آپؐ کو یقین تھا کہ آپ خدا کے ہی الہامی الفاظ دہرا رہے ہیں۔ یہ ایک تکلیف دہ اور کٹھن عمل تھا۔ ایک

مرتبہ آپؐ نے فرمایا: ''ایک بھی موقعہ ایسا نہیں آیا جب میں نے وحی آنے پر اپنی روح کو جسم سے نکلتے ہوئے نہ خیال کیا ہو''۔(6) کبھی کبھی پیغام بہت واضح ہوتا۔ آپؐ کو حضرت جبرئیل کی آواز اور الفاظ واضح طور پر سمجھ آ جاتے۔ آپ کو یہ الفاظ حیات بخش بارش کی طرح اپنے اوپر'' نازل ہوتے ہوئے'' محسوس ہوتے تھے لیکن الوہی آواز اکثر مبہم اور غیر واضح ہوتی: ''کبھی کبھی گھنٹیاں بجنے جیسی آواز آتی، اور یہ موقعہ میرے لیے نہایت مشکل ہوتا۔ جب پیغام سمجھ آ جاتا تو گھنٹیوں کی آواز آنا بند ہو جاتی۔''(7) آپؐ کو واقعات کے زیریں بہاؤ پر کان دھرنا پڑے تاکہ حقیقی صورتحال کو سمجھ سکیں۔ آپؐ کا رنگ اس کوشش کے دوران زرد پڑ جاتا اور آپؐ اپنی چادر اوڑھ لیتے، کہ جیسے خود کو الوہی جلال کی شدت سے بچا رہے ہوں۔ جب آپؐ کسی مسئلے پر غور وخوض کے لیے دروں بینی کرتے تو سردیوں میں بھی پسینے میں شرابور ہو جاتے۔ قرآن میں خدا نے حضرت محمدؐ کو ہدایت کی کہ نازل ہونے والی ہر وحی کو توجہ سے سنیں؛ آپؐ پر لازم تھا کہ کسی آیت کا مفہوم پوری طرح واضح ہو جانے کے بعد ہی اس کا کوئی مطلب نکالیں۔(8)

چنانچہ، قرآن میں خدا حضرت محمدؐ کے ذریعہ براہ راست اہل مکہ سے مخاطب ہوا ــــ بالکل اسی طرح جیسے اس نے یہودی صحائف میں عبرانی پیغمبروں کو وسیلہ بنایا تھا۔ لہٰذا قرآن کی زبان مقدس ہے ــــ کیونکہ...... مسلمانوں کے عقیدے کے مطابق...... یہ کلام اللہ پر مشتمل ہے۔ جب کے پیروکاروں نے آپؐ کے منہ سے اور پھر دیگر حفاظ سے الوہی کلام کی تلاوت سنی تو خود کو اللہ کے روبرو محسوس کیا۔ بائبلی عبرانی کو بھی عین اسی طرح ایک مقدس زبان خیال کیا جاتا ہے۔ عیسائیوں کے ہاں مقدس زبان کا یہ تصور موجود نہیں کیونکہ عہد نامہ جدید کی عبرانی میں کوئی مقدس بات نہیں؛ ان کے صحائف نے یسوع مسیحؑ کو انسانیت سے خدا کے کلام کے طور پر پیش کیا۔ کسی بھی صحیفے کی طرح قرآن نے ہماری ناپائیدار، فانی دنیا اور اللہ کے درمیان پل تعمیر کرتے ہوئے ماورائیت سے رُوبروئی کا تجربہ مہیا کیا۔

آنحضرتؐ کے پیروکار بے تابی سے ہر نئی وحی کا انتظار کرتے؛ جب آپؐ انہیں وحی پڑھ کر سناتے تو وہ زبانی یاد کر لیتے یا کسی چیز پہ لکھ لیتے۔ اپنے صحیفے کی خوب صورت زبان نے انہیں مسحور کر دیا اور وہ قائل ہو گئے کہ یہ کلام صرف خدا کا ہو سکتا تھا۔ عربی زبان سے ناواقف کوئی شخص قرآن

کی خوبصورتی کا صحیح طور پر ادراک نہیں کر سکتا، کیونکہ ترجمے میں اصل کی محض ایک جھلک ہی دیکھی جا سکتی ہے۔ کچھ آیات بار بار آتی ہیں۔قرآن کا کوئی بدیہی ڈھانچہ اور ترتیب نہیں۔اس میں متواتر مدلل یا منظم انداز میں کسی موضوع پر بات نہیں کی گئی۔لیکن قرآن کو ترتیب دیتے وقت واقعات کی زمانی ترتیب ملحوظ خاطر نہیں تھی۔موجودہ مقبول صورت میں قرآن کی طویل صورتیں پہلے اور چھوٹی صورتیں آخر میں رکھی گئی ہیں (ترتیب توقیفی)۔چنانچہ سورتوں کی ترتیب اہمیت نہیں رکھتی۔ ہر سورۃ میں بنیادی تعلیمات موجود ہیں اور آپ کسی بھی جگہ سے کھول کر قرآن کے عمیق پیغامات تک رسائی حاصل کر سکتے ہیں۔

اپنے عہد کے زیادہ تر عربوں کی طرح حضرت محمد لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے۔لفظ قرآن کا لغوی مطلب ''پڑھنا'' ہے۔یہ نجی طور پر مطالعہ کے لیے نہیں تھا، بلکہ بیش تر صحائف کی طرح اس کا مقصد بہ آواز بلند پڑھ کر سنایا جانا تھا، اور آواز مفہوم کا ایک لازمی حصہ تھی۔عرب میں شاعری ایک اہم چیز تھی۔شاعر اپنے قبیلے کا ترجمان، سماجی مورخ اور ثقافتی سند تھا۔وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ عربوں نے پڑھی جا رہی چیز کو سننے کا ایک لطیف ذوق بھی پیدا کر لیا تھا۔[9] گویے سالانہ میلوں میں سارے جزیرہ نما سے آئے ہوئے پُرخروش سامعین کو قصے سناتے۔ ہر سال مکہ سے باہر عکاظ کے مقام پر شاعری کا ایک اہم مقابلہ منعقد ہوتا تھا، اور انعام یافتہ نظموں کو طلائی دھاگے سے کالے کپڑے پہ لکھ کر کعبہ کی دیواروں پر آویزاں کر دیا جاتا تھا۔چنانچہ، ابتدائی مسلمان متن میں وہ زبانی اشارے بھی سمجھنے کے قابل تھے جو ترجمہ میں ضائع ہو جاتے ہیں۔انہوں نے دیکھا کہ موضوعات، الفاظ، جملے اور صوتی انداز بار بار آتے ہیں — جیسے کسی نغمہ موسیقی میں — اور لطیف انداز میں اصل نغمگی کو بڑھاتے اور پیچیدگی کی تہیں چڑھاتے جاتے ہیں۔قرآن میں تکرار دانستہ ہے؛ اس کے تصورات، تشبیہات اور کہانیاں داخلی بازگشت میں باہم مربوط ہیں جو اس کی مرکزی تعلیمات کو اجاگر کرتی ہیں۔بظاہر جدا جدا نظر آنے والی آیات آپس میں منسلک اور ایک دوسرے کی تکمیل کرتی ہیں۔قرآن محض معلومات ودیعت نہیں کر رہا تھا کہ جسے پل بھر میں دوسروں تک منتقل کیا جا سکتا۔آنحضرتؐ کی طرح سامعین کو بھی اس کی تعلیمات آہستہ آہستہ اپنے اندر جذب کرنا پڑیں؛ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کی تفہیم زیادہ عمیق اور پختہ ہوگئی۔قرآن کی خوب

صورت اور تشبیہاتی زبان اور نغمگی نے انہیں اپنے ذہنی عوامل میں دھیما پن لانے اور شعور کے ایک مختلف انداز میں داخل ہونے میں مدد دی۔

امریکی محقق Michael Sells نے بیان کیا ہے کہ جب مصر میں ایک کھچا کھچ بھری بس میں ڈرائیور نے تلاوت قرآن کی کیسٹ لگائی تو کیا واقعہ پیش آیا: ''ایک مراقباتی طمانیت چھا گئی۔ لوگ پُرسکون ہوگئے۔ جگہ حاصل کرنے کی تگ و دو ختم ہوگئی۔ باتیں کرتے ہوئے لوگوں کی آواز مدھم اور شائستہ ہوگئی۔ دیگر لوگ خاموش، سوچوں میں کھوئے ہوئے تھے۔ مشترکہ بھائی چارے کے احساس نے بے چینی پر غلبہ پا لیا تھا۔''(10) مراقبہ کی زیادہ تر روایات میں سانس کو منظم کرنا لازمی ہے۔ یوگیوں کو معلوم ہوا کہ اس طرح وسعت کا احساس پیدا ہوتا ہے، موسیقی کے اثر جیسا، بالخصوص جب آپ خود موسیقی بجا رہے ہوں۔(11) قرآن کے قاری آہستہ آہستہ سانس باہر نکالتے ہوئے طویل آیات پڑھتے ہیں، اور سانس اندر کھینچنے پر خاموش وقفوں میں مراقبہ کرتے ہیں۔ سامعین کا بھی اپنی سانسوں کو اسی کی مطابقت میں ایڈجسٹ کرنا اور اس میں ایک سکون اور راحت محسوس کرنا فطری امر ہے۔ یہ معالجاتی تاثر انہیں متن کی مخفی تعلیمات کو سمجھنے کے قابل بناتا ہے۔

خدا کہیں اوپر بیٹھ کر واضح ہدایات جاری نہیں کر رہا تھا۔ الوہی آواز اپنا حوالہ دینے کا انداز متواتر تبدیل کرتی رہی ــــ جیسے ''ہم''، ''وہ''، ''میرا رب''، ''اللہ'' یا ''میں۔'' یوں تعلق داری پیغمبرؐ اور ان کے سامعین کو منتقل ہوگئی۔ خدا بیّن طور پر مذکر بھی نہیں تھا۔ ہر تلاوت کا آغاز ایک جملے سے ہوتا ہے: ''شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو الرحمٰن اور الرحیم ہے۔'' اللہ اسم مذکر تھا، لیکن انشا پردازی کی رو سے الوہی نام الرحمٰن اور الرحیم مونث نہیں، بلکہ اشتقاقی اعتبار سے ''رحم'' (Womb) لفظ کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں۔ ایک جزواً مونث شخصیت تقریباً تمام ابتدائی وحیوں میں مرکزی حیثیت رکھتی تھی۔ ہمیں استقرار حمل یا وضع حمل کے ملفوف استعارے ملتے ہیں: ایک عورت کا تصور جس کا بچہ کھو گیا ہو، اور ایک نومولود بچی جسے مایوس والدین نے قتل کر دیا۔(12) یہ واضح مونث پن مکہ کے جارحانہ پدرسری معاشرے میں حیرت انگیز تھا۔ اس سے یہ بھی وضاحت ہوتی ہے کہ قرآن کا پیغام سمجھنے والے ابتدائی افراد میں عورتوں کی تعداد اتنی زیادہ کیوں تھی۔

ابتدائی سورتوں میں سے ہر ایک میں خدا نے بندے کو مخاطب کیا؛ خدا نے اکثر اپنی تعلیمات

سوال کی صورت میں پیش کرنے کو ترجیح دی۔ "کیا تو نے نہیں سنا؟" "کیا تو نہیں دیکھا؟" "کیا تو نے غور نہیں کیا؟" یوں ہر سامع کو اپنے آپ سے سوال کرنے کی دعوت دی گئی۔ ان سوالات کا کوئی بھی جواب عموماً گرامر کے لحاظ سے مبہم یا غیر قطعی تھا، جس کے باعث سننے والے کو خود غور و خوض کرنے کا موقع ملتا۔[13] اس نئے مذہب کا تعلق مابعد الطبیعیاتی قطعیت حاصل کرنے سے نہیں تھا: قرآن نے لوگوں سے ایک مختلف قسم کی آگہی پیدا کرنے کا مطالبہ کیا۔

قرآن کے ابتدائی پیغام میں روزِ قیامت کا مسیحی تصور مرکزی حیثیت رکھتا تھا۔ حضرت محمدؐ جانتے تھے کہ مکہ بحران سے دوچار ہے کیونکہ قریش خود کو اپنے افعال کے لیے جوابدہ نہیں سمجھتے تھے۔ ستیپیوں میں کریم شاید مغرور اور فخر مند رہا ہوگا، لیکن وہ خود کو اپنے سارے قبیلے کے لیے ذمہ دار محسوس کرتا تھا۔ تاہم، قریش نجی دولت سمیٹنے میں مصروف تھے اور انہیں "بے کسوں" کی حالت زار کی کوئی فکر نہ تھی۔ لگتا تھا کہ انہیں اس بات کا کوئی احساس نہیں تھا کہ ان کے اعمال دور رس نتائج پیدا کریں گے۔ اس بے توجہی کا توڑ کرنے کے لیے قرآن نے تعلیم دی کہ ہر فرد اپنے اعمال کے لیے خدا کو جوابدہ ہوگا۔ ایک "یوم الدین" (روز حساب) آئے گا۔ اس عربی اصطلاح کا مطلب "صداقت کا لمحہ" بھی بنتا ہے۔[14] موت آنے پر انسان ان تکلیف دہ حقائق کا سامنا کریں گے جن سے وہ گریزاں رہے۔ وہ ایک خوفناک وجودیاتی مراجعت کا تجربہ کریں گے جس میں ہر ٹھوس، اہم اور پائیدار نظر آنے والی چیز عارضی اور ناپائیدار ثابت ہوگی۔ ابتدائی سورتوں نے قطعی اور مختصر آیات میں سراب کا یہ پردہ اتار پھینکا۔

جب سورج کی دھوپ تہہ ہو جائے

اور جب تارے میلے ہو جائیں

اور جب پہاڑ چلائے جائیں

اور جب بیاتی اونٹنیاں چھٹی پھریں

اور جب جنگل کے جانوروں میں رول پڑ جائے

اور جب دریا جھونکے جائیں.....

ہر کوئی جان لے گا جو وہ لے کر آیا۔[15]

سورج، چاند اور ستارے غائب ہو جائیں گے۔حتیٰ کہ حاملہ اونٹنی، صحرائے عرب کی سب سے قیمتی شئے، بھی بے وقعت ہو جائے گی۔اصل اہمیت صرف انفرادی طرزِ عمل کی تھی:

اس دن ہو پڑیں گے لوگ طرح طرح پر

کہ ان کو دکھا دیے جائیں گے ان کے عمل

سو جس نے کی ذرہ برابر بھلائی وہ دیکھ لے گا اسے

اور جس نے کی ذرہ برابر برائی وہ دیکھ لے گا اسے [16]

اس وقت غیر اہم لگنے والے افعال عارضی ثابت ہوتے؛ کوئی خفیف سی خود غرضی اور درشتی یا اس کے برعکس بلا سوچے سمجھے کوئی فیاضی بھی انسانی زندگی کا پیمانہ بن جاتی: ''چھڑانا گردن کا یا کھلانا بھوک کے دن میں یتیم کو جو قرابت والا ہے یا محتاج کو جو خاک میں رُل رہا ہے۔''[17]

یہ ''اعمال صالح'' انجام دینے والے کسی بھی شخص کو بطور انعام جنت (علیین) ملتی، لیکن مادی چیزوں کے حصول پر توجہ مرکوز کرنے والوں کو جہیم میں سزا ملنا تھی۔۔جہیم ایک غیر مانوس لفظ ہے جس کا ترجمہ عموماً ''بھڑکتی ہوئی آگ'' کیا جاتا ہے، لیکن قرآن خاتمہ ٔ زماں پر مبنی ایک خام تصور کا پرچار نہیں کر رہا تھا۔جن آیات میں جہیم کا ذکر ہے ان میں غیض وغضب کی بجائے افسردگی اور دکھ کا تاثر پایا جاتا ہے۔بعد کی مسلم روایت نے جنت، جہنم اور روزِ قیامت کے تصورات کی وضاحت کی، لیکن قرآن کی زبان بدستور مبہم اور پراسرار رہی۔اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ کہ قرآن سامع کو ہر وقت مواخذہ کے لیے تیار رہنے پر مجبور کرتا ہے۔روزِ حساب محض کوئی مستقبل بعید کا واقعہ نہیں تھا۔یہ لمحہ ٔ جاریہ میں ''لمحہ ٔ صداقت'' بھی تھا۔تفتیشی، داخلی سوال گری اور صیغہ ٔ حال کے استعمال نے سننے والوں کو روزمرہ بنیادوں پر اپنے رویے کے ممکنہ نتائج کا سامنا کرنے پر مجبور کیا۔

یہ معلوم ہونا کیسا لگتا ہوگا کہ آپ نے کرہ ٔ ارض پر اپنا وقت ضائع کیا اور اب کچھ بھی کرنے کے قابل نہیں تھے؟ قرآن بہ اصرار پوچھتا ہے: ''تم کدھر چلے جارہے ہو؟''[18] بنی نوع انسان خلقاً شریر نہیں، بلکہ بھول کا شکار تھے؛ وہ ان غیر راحت بخش خیالات کو ذہن کی کال کوٹھڑیوں میں پھینک دینا چاہتے تھے۔چنانچہ انہیں ایک متواتر یاد دہانی، ''ذکر'' کی ضرورت تھی۔[19] خدا نے آنحضرتؐ پر زور دیا: ''انہیں یاد دلاؤ، تم صرف ذکر ہی کر سکتے ہو۔''[20]

چنانچہ لوگوں کو خود آگاہ، اپنے اعمال سے واقف بننا ضروری تھا۔ ان کے لیے لازمی تھا کہ وہ اپنے اندر ''تقویٰ'' کی خصوصیت پیدا کریں۔ کبھی کبھی اس لفظ کا ترجمہ ''خوف'' بھی کیا جاتا ہے، لیکن ''یاد گیری'' زیادہ مناسب ترجمہ ہے۔ انہیں متواتر خود غرضی، طمع اور غرور کے خلاف خبردار رہنا تھا۔ خود کو جہنم کے خوف سے ڈرانے کی بجائے انہیں فطری دنیا میں خدا کی فیاضی کے نشانات (آیۃ) پر غور و فکر کرنا اور اس کی رحمت کی نقالی کرنا چاہیے تھی:

غور کرو اونٹوں پر کہ کیسے بنائے ہیں
اور آسمان پر کہ کیسا اس کو بلند کیا ہے
اور پہاڑوں پر کہ کیسے کھڑے کر دیے ہیں
اور زمین پر کہ کیسے صاف بچھائی ہے۔ (الفجر 20-17، 89:17-20)

ساری کائنات ایک پردہ تھی جس نے حاضر و ناظر خالق کو چھپا رکھا تھا۔ دن اور رات کی آمد و شد، سورج اور چاند کا چکر، حیات بخش بارشیں اور نوعِ انسانی کی تعمیر کردہ عالیشان عمارتیں خدا کے موجود ہونے کا نشان تھیں۔ متواتر اور منظم انداز میں ان نشانات پر غور و فکر کے ذریعے وہ پسِ پردہ کارفرما حقیقت سے آگاہ ہوئے اور احساسِ تشکر سے بھر گئے۔

تب تک قریش کمزور سے نفرت کرتے تھے؛ انہیں یقین تھا کہ ناکامی اور غربت پست حیثیت کی دلیل تھی، چنانچہ انہوں نے غریبوں، یتیموں اور بیواؤں کے لیے کوئی ہمدردی محسوس نہ کی۔ لیکن اگر وہ ہر لمحے خود کو خدا پر منحصر مان لیتے تو اپنے عارضی پن سے آگاہ ہو جاتے اور ان کی نخوت جلال و استعجاب کے سامنے ماند پڑ جاتی۔ وہ اپنی پُرغرور خود انحصاری اور انسانی یا الوہی کسی بھی مخلوق کے سامنے سجدہ ریز ہونے سے انکار کو ایک طرف رکھ دیتے۔ حضرت محمدؐ چاہتے تھے کہ مکہ کا ہر مرد، عورت اور بچہ عاجزانہ تشکر کو اپنا خصوصی وصف بنا لے۔

آنحضرتؐ محض سماجی اصلاح کے لیے کام کرنے پر ہی قانع نہ تھے: آپؐ کو یقین تھا کہ داخلی تقلیب کے بغیر ایک خالصتاً سیاسی پروگرام محض سطحی ہوگا۔ یہ کام کرنے کی خاطر آپؐ نے اپنی چھوٹی سی جماعت کو عبادت کا طریقہ سکھایا جو انہیں نیا رویہ اپنانے کے قابل بناتا۔ اول، وہ صلوٰۃ کے لیے اکٹھے ہوتے: عاجزانہ سجدہ انہیں اپنی حقیقی صورتِ حال کی یاد دہانی کرواتا رہتا۔ صلوٰۃ ان

کے روزمرہ کاروبار میں دخل اندازی کرتی اور ہر دم اللہ کی اولین حیثیت کا احساس دلاتی رہتی۔ مروۃ میں تربیت یافتہ مردوں اور عورتوں کے لیے غلاموں کی طرح سر جھکانا بہت مشکل تھا، اور بہت سے قریش اس عاجزانہ انداز سے خفا ہوئے۔ لیکن صلوٰۃ کا جسمانی روٹین اپنے سارے وجود کو اللہ کی اطاعت (اسلام) میں پیش کرنے کی علامت تھا۔ اس نے ان کے جسموں کو جھکنے اور تکبرو غرور کا خود پسندانہ جذبہ برطرف کرنے کی تعلیم دی۔ ایسے مرد و زن مسلمان تھے جنہوں نے اطاعت کا یہ انداز اپنا لیا ہو اور خدا کا غلام بننے پر فخر مند ہوں۔

دوم، مسلم برادری (امت) کے ارکان اپنی آمدنی کا ایک حصہ غریبوں کو بطور خیرات دینے کے پابند تھے۔ اس ''خالص یا پاک نذر (زکوٰۃ) نے روایتی بدوی فیاضی میں سے انا پرستی کو نکال دیا؛ انہوں نے اپنی بے مہار اور اصراف پسندانہ آزادروی کا مظاہرہ کرنے کی بجائے قبیلے کے نسبتاً کمزور اراکین کے لیے باقاعدہ اور غیر ڈرامائی مدد ممکن بنائی۔ نیا کریم اب ایک ایسا شخص نہیں تھا جو ایک ہی رات میں اپنی ساری دولت لٹا دیتا، بلکہ وہ شخص کریم تھا جو بلا تکان ''منصفانہ کام'' انجام دیتا۔ اس مرحلے پر نیا عقیدہ تزکیہ (تطہیر) کہلاتا تھا۔[21] غریبوں اور لاچاروں کی دیکھ بھال کرنے، روزانہ اور ہر وقت مہربانی کے چھوٹے چھوٹے کام انجام دینے کے ذریعے مسلمانوں نے ہمدردی کی خوبی کو اوڑھنا سیکھا اور آہستہ آہستہ ایک ذمہ دارانہ، دردمندانہ جذبہ پیدا کیا جو بذات خود اللہ کی فیاضی کی نقالی تھا۔ انہیں نجات پانے کے لیے اپنے دلوں کو غرور اور خود غرضی سے پاک کرنا اور ایک روحانی صفت حاصل کرنا تھی۔

آنحضرتؐ تین سال تک کھل کر سامنے نہ آئے اور صرف مخصوص منتخب افراد کو ہی تبلیغ کرتے رہے، لیکن 615ء میں اس وقت آپؐ کو کچھ مایوسی ہوئی جب اللہ نے سارے ہاشمی قبیلے تک اپنا پیغام پہنچانے کی ہدایت کی۔[22] ''یہ کام میری استطاعت سے باہر ہے،'' آپؐ نے حضرت علیؓ سے فرمایا۔ لیکن آپؐ نے قدم آگے بڑھاتے ہوئے قبیلے کے چالیس بڑوں کو کھانے پر بلایا۔ یہ حقیر سی دعوت بذات خود ایک پیغام تھی؛ اب اصراف پسندانہ مہمان نوازی نہیں کی جاتی تھی۔[23] تعیش محض دولت کا ضیاع ہی نہیں بلکہ ایک ناشکری، اللہ کی نعمتوں کی ناسپاسی بھی تھا۔ بزرگوں کے

آنے پر جب حضرت علیؓ نے انہیں بکرے کی ایک ران اور دودھ کا ایک پیالہ ہی پیش کیا تو انہوں نے ناک بھوں چڑھائی۔ بعد میں حضرت علیؓ کی بیان کردہ کہانی روٹیوں اور مچھلیوں کے ساتھ حضرت یسوع مسیحؑ کے معجزے کی کہانی جیسی تھی: کھانا ایک شخص کے لیے بھی بہ مشکل کافی ہونے کے باوجود سب نے سیر ہو کر کھایا۔ کھانے کے بعد آنحضرتؐ مجمعے سے خطاب کرنے کھڑے ہوئے، ان کو وحی کے متعلق بتایا اور اپنے نئے مذہب اسلام کے اصول واضح کیے۔ لیکن حضرت ابوطالب کے سوتیلے بھائی ابولہب نے بات کاٹی اور بولا ''اس نے تم لوگوں پر جادو کر دیا ہے۔'' سب لوگ منتشر ہو گئے۔ حضرت محمدؐ نے انہیں اگلے روز دوبارہ دعوت دی اور اس مرتبہ اپنی بات ان تک پہنچانے میں کامیاب ہو گئے: ''اے عبدالمطلب کے بیٹو، میں کسی ایسے عرب کو نہیں جانتا جو اپنے لوگوں کے لیے اس سے زیادہ بہتر پیغام لایا ہو جیسا کہ میں لایا ہوں۔'' آپؐ نے بات مکمل کی: ''اللہ نے مجھے حکم دیا کہ تمہیں اس کی جانب بلاؤں۔ تو تم میں سے کون ہے جو اس کام میں میرا ساتھ دے، میرا بھائی اور میرا جانشین بن کر؟''

ایک خاموشی چھا گئی، اور بزرگوں نے حیرت کے عالم میں ایک دوسرے کے منہ کی طرف دیکھا۔ وہ تو محض ایسے (حضرت) محمدؐ کو جانتے تھے جو اپنے رشتہ داروں کی امداد پر گزارا کرنے والے نوجوان تھے۔ انہوں نے اللہ کا پیغمبر ہونے کا دعویٰ کیسے کر دیا؟ حتیٰ کہ حضرت محمدؐ کے کزن حضرت جعفرؓ اور ان کا لے پالک بیٹا زیدؓ بھی کچھ نہ بول پائے؛ لیکن انجام کار تیرہ سالہ حضرت علیؓ یہ سب کچھ مزید برداشت نہ کر پائے اور بولے: ''اے، پیغمبر خدا، میں اس معاملے میں آپؐ کا مددگار بنوں گا!'' آنحضرتؐ نے محبت سے آپ کی گردن پر ہاتھ رکھا اور فرمایا: ''یہ میرا بھائی، میرا ساتھی اور تمہارے درمیان میرا جانشین ہے۔ اس کی بات غور سے سننا اور اس کی اطاعت کرو۔'' معاملہ حد سے بڑھ گیا تھا۔ سحر ٹوٹا اور بزرگوں نے بات ہنسی میں اڑانے کی کوشش کی: ''اس نے تمہیں حکم دیا ہے کہ اس کے بیٹے کی بات سنو اور اس کا حکم مانو!'' وہ مکان سے باہر نکلتے ہوئے ابو طالب کا مضحکہ اڑا رہے تھے۔[24]

حضرت محمدؐ نے اس گستاخی کو سہتے ہوئے شہر میں اپنی تبلیغ کا دائرہ وسیع کر دیا لیکن زیادہ کامیابی نہ ہوئی۔ کسی نے بھی آپؐ کے سماجی پیغام پر اعتراض نہ کیا۔ وہ جانتے تھے کہ مروۃ کے مطابق انہیں

قبیلے کے غریبوں کو اپنی دولت میں شریک کرنا چاہیے تھا۔ خودغرض اور حریص ہونا ایک بات تھی اور ان رویوں کا دفاع کرنا بالکل دوسری۔ بیش تر افراد نے روزِ قیامت پر اعتراض کیا اور اسے محض بوڑھی عورتوں کی کہانی قرار دیا۔ مٹی میں گل سڑ جانے والے جسم دوبارہ کیسے زندہ ہو سکتے تھے؟ کیا حضرت محمدؐ سنجیدگی سے کہہ رہے تھے کہ ان کے محترم اجداد اپنی قبروں میں سے اٹھ کر "تمام ہستیوں کے مالک کے حضور" کھڑے ہوں گے۔[25] قران نے جواب دیا کہ کوئی بھی شخص حیات بعد الموت کو "ثابت" نہیں کر سکتا، اور اگر اللہ مادۂ منویہ کے ایک قطرے سے انسان تخلیق کر سکتا ہے، تو یقیناً مردے کو دوبارہ زندہ کرنے پر بھی قادر ہے۔[26] یہ نکتہ بھی اٹھایا گیا کہ روزِ حساب کے تصور کا مضحکہ اڑانے والے لوگ وہی تھے جو اپنے استحصالی، خودغرضانہ رویے میں تبدیلی لانے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے تھے۔[27] اپنی زندگی کی مطلق قدر و اہمیت کے بارے میں قرآن کے بار بار استفسار پر انہوں نے استرداد اور تمسخر میں پناہ لی۔ لیکن اپنی تشکیکیت کے باوجود زیادہ تر قریش حضرت محمدؐ کو ان کے حال پہ چھوڑ دینا کافی سمجھتے تھے۔ وہ کاروباری اور تاجر لوگ تھے جنہیں نظریاتی بحث کا کوئی ذوق نہ تھا؛ اور وہ جانتے تھے کہ ایک سنگین داخلی جھگڑا تجارت کے حق میں برا ہے۔ بہرصورت، غلاموں، غصیلے نوجوانوں اور ناکام تاجروں کا یہ چھوٹا سا ٹولہ باعثِ خطرہ نہیں تھا اور ان کی تحریک یقیناً اپنی موت آپ مر جاتی۔

آنحضرتؐ خود بھی کھلی محاذ آرائی کے لیے بے تاب نہ تھے۔ آپؐ کو "شہروں کی ماں" مکہ کو نقصان پہنچانے کی کوئی خواہش نہ تھی۔ آپؐ جانتے تھے کہ کچھ قریش آپؐ کو بادشاہ بننے کا خواہش مند سمجھتے تھے ـــ عربوں کے ہاں ایک ناپسندیدہ تصور جو بادشاہت کے بارے میں گہرے شکوک رکھتے تھے۔ لیکن آنحضرتؐ کے کوئی سیاسی عزائم نہ تھے۔ جیسے معترضین کو تسلی دینے کی خاطر اللہ نے دوٹوک انداز میں آپؐ کو بتایا کہ عوامی عہدے کی خواہش ہرگز نہ کریں۔ آپؐ محض ایک نـــذیـــر (خبردار کرنے والے پیغمبر) تھے، اور آپؐ کو قریش کے ساتھ محبت سے بات کرنا، اشتعال انگیزی سے بچنا اور ان کے دیوتاؤں پر تنقید سے دامن بچانا تھا۔ ماضی میں عظیم پیغمبروں نے ایسا ہی کیا تھا۔[28] ایک پیغمبر کو منکسر المزاج ہونا چاہیے تھا؛ اپنی آرا کا مغرورانہ انداز میں ڈھنڈورا پیٹنا یا دوسروں کے احساسات کو روندنا اسے زیبا نہیں تھا؛ بلکہ اسے چاہیے تھا کہ ہمیشہ اجتماعی مفاد کو ترجیح دے۔

کوئی پیغمبر سب سے پہلے ایک مسلم ''یعنی خدا کے حضور خود کو پیش کرنے والا'' تھا۔ (29) کسی سنگین تنازع سے اجتناب کرنے کی خواہش کے باعث آنحضرتؐ نے کسی بھی مرحلے پر اپنے پیغام کے وحدانیت پرستانہ عنصر پر بہت زیادہ زور نہ دیا۔ حنیفوں کی طرح آپؐ بھی قائل تھے کہ اللہ واحد خدا ہے، لیکن ابتداً میں آپؐ نے کعبہ کے گرد رکھے پتھر کے بتوں کی پرستش یا تین غرانیق کے مسلک کو تنقید کا نشانہ نہ بنایا۔ زیادہ تر عظیم اولیاً کی طرح آپؐ کو بھی راسخ العقیدگی میں زیادہ دلچسپی نہ تھی۔ (30) مابعد الطبیعیاتی قیاس آرائی لوگوں کو جھگڑالو بنا دیتی اور باعثِ افتراق ثابت ہوتی۔ ''انصاف کے کاموں'' کو رواج دینا زیادہ اہم تھا، بہ نسبت کسی دینیاتی نکتۂ نظر پر اصرار کرنے کے جو لوگوں کو آپؐ سے ناراض اور دور کر دیتا۔ لیکن تناؤ بڑھتا جا رہا تھا۔ 616ء میں کچھ قریش نے مسلمانوں پر اس وقت حملہ کر دیا جب وہ شہر سے باہر ایک بستی میں نماز ادا کر رہے تھے۔ اس واقعے نے مکہ میں ہر ایک کو حیران کر دیا، اور دونوں فریقوں نے مفاہمت کی کوشش کی۔ غالباً واقعے کے بعد وہ آیات نازل ہوئیں جنہیں (ملعون) سلمان رشدی اور کچھ دیگر نے بھی ''شیطانی آیات'' قرار دیا۔ (31) یہ واقعہ صرف دو ابتدائی سیرت نگاروں نے بیان کیا ہے، اور کچھ محققین کے خیال میں یہ الہامی ہے، حالانکہ اس رائے کی حمایت میں کوئی وجہ موجود نہیں۔ دونوں مورخین اس وقت شہر میں مفاہمت کے لیے خواہش کو نمایاں کرتے ہیں۔ ابن سعد نے اپنے بیان کا آغاز کرتے ہوئے کہا کہ قریش کے ساتھ ایک ناقابلِ تنسیخ قطع تعلق سے گریز کرنے کی خاطر حضرت محمدؐ ''اکیلے بیٹھ گئے اور خواہش کی کہ آپؐ پر کوئی ایسی وحی نازل نہ ہو جو انہیں دور کر دے۔'' (32)

طبری یوں آغاز کرتا ہے:

> جب پیغمبرؐ خدا نے دیکھا کہ ان کے لوگوں نے منہ موڑ لیا ہے تو بہت دکھی ہوئے کہ وہ خدا کی جانب سے ان کے لائے ہوئے پیغام سے دور ہو گئے ہیں۔ آپؐ نے خواہش کی کہ اللہ کوئی ایسا پیغام بھیجے کہ اپنے لوگوں کے ساتھ آپؐ کی مفاہمت ہو جائے۔ اپنے لوگوں سے محبت کے باعث آپؐ کو بہت خوشی ہوتی اگر آپؐ کے کام کو مشکل بنانے والی رکاوٹ دور ہو سکتی؛ چنانچہ آپؐ اس بارے میں غور و فکر کرنے لگے اور اس کے خواہش مند ہوئے۔ (33)

طبری مزید بتاتا ہے کہ ایک روز آنحضرتؐ کعبہ کے قریب کچھ بزرگوں کے ساتھ بیٹھے ایک نئی سورۃ پڑھ رہے تھے جس میں اللہ نے آپؐ پر تنقید کرنے والوں کو یقین دہانی کروائی تھی: حضرت محمدؐ کا ارادہ انتشار پیدا کرنے کا نہیں تھا۔۔۔ الوہی آواز نے اصرار کیا؛ آپؐ خدانخواستہ کسی سودا میں مبتلا یا جن کے زیرِ اثر نہیں تھے؛ آپؐ نے الوہی ہستی کا ایک سچا تجربہ کیا تھا اور لوگوں کو اپنی دیکھی یا سنی ہوئی بات ہی بتا رہے تھے۔[34] لیکن تب حیرت انگیز طور پر آپؐ کے منہ سے "خدا کی تین بیٹیوں" کے متعلق آیات جاری ہوگئیں: "بھلا تم دیکھو تو لات اور عزیٰ کو اور منات تیسرے پچھلے کو؟" قریش فوراً اٹھ کھڑے ہوئے اور غور سے سننے لگے۔ وہ اپنے ایماء پر اللہ کے آگے سفارش کرنے والی دیویوں سے محبت کرتے تھے۔ آنحضرتؐ کی آواز دوبارہ آئی: "یہ رفیع الشان غرانیق ہیں جن کی ثالثی منظور شدہ ہے۔"

[شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانی نے اس آیت کی تفسیر میں لکھا ہے کہ لات نامی بت طائف والوں کے ہاں بہت معظم تھا۔ منات نامی بت اوس وخزرج اور خزاعہ جبکہ عزیٰ کو قریش اور بنی کنانہ وغیرہ عظیم سمجھتے تھے۔ ان کے نزدیک بہ لحاظ درجہ ان کی ترتیب یہ تھی: عزیٰ، لات اور منات۔ علامہ یاقوت نے معجم البلدان میں یہ ترتیب نقل کی اور لکھا ہے کہ قریش کعبہ کا طواف کرتے ہوئے یہ الفاظ کہتے تھے: والـلات والـعُزیٰ و مناۃ الثالثۃ الاخریٰ. ھٰـؤلاءِ الـغـرانیق الـعـلیٰ وانَّ شفاعتھُن لترتجیٰ۔ کتبِ تفسیر میں ایک موقع پر قصہ نقل کیا گیا ہے جو جمہور محدثین کے اصول پر درجۂ صحت کو نہیں پہنچتا۔ اگر فی الواقع اس کی کوئی اصل ہے تو شاید یہی ہوگی کہ آپؐ نے مسلمانوں اور کافروں کے مخلوط مجمع میں یہ سورۃ پڑھی۔ کفار کی عادت تھی کہ لوگوں کو قرآن سننے نہ دیں اور بیچ میں بول پڑیں۔ جب یہ آیت پڑھی تو کسی کافر شیطان نے آپؐ کی آواز میں آواز ملا کر آپؐ ہی کے لب ولہجہ میں وہ الفاظ کہہ دیے ہوں گے جو ان کی زبانوں پر چڑھے ہوئے تھے۔ نبی کی زبان پر شیطان کو تصرف حاصل ہونا ممکن نہیں؛ اور جس چیز کا ابطال آگے کیا جارہا ہے اس کی مدح سرائی کے کیا معنی! اضافہ از مترجم]

طبری کہتا ہے کہ شیطان نے آپؐ کے منہ سے یہ الفاظ ادا کروائے۔ عیسائیوں کے ہاں یہ خیال بہت تشویش انگیز ہے جو شیطان کو مجسم شر مانتے ہیں۔ بلاشبہ قرآن تنزل یافتہ فرشتے کی کہانی سے واقف ہے جس نے خدا کی حکم عدولی کی۔۔۔ اس فرشتے کو ابلیس کہا گیا (یونانی زبان کے *diabolos* یعنی devil / شیطان سے ماخوذ لفظ)۔ لیکن دیویوں کی تعریف میں یہ الفاظ ادا کروانے

والا شیطان عیسائیوں کے شیطان کی نسبت کہیں کم خطرناک تھا۔ شیطان محض جنات کی ہی ایک قسم تھے؛ وہ محض "تحریص دلانے والے" تھے جو انسانوں کو بہلا پھسلا کر درست راہ سے منحرف کر دیتے۔ جنات کی طرح شیطان بھی ہر جگہ موجود، بدخواہ اور خطرناک تھے، لیکن عیسائیوں کے devil کے ہم سر نہیں۔ حضرت محمدؐ قریش کے ساتھ اچھے تعلقات کے خواہاں تھے؛ آپؐ کو معلوم تھا کہ وہ ان دیویوں سے کس قدر عقیدت رکھتے تھے۔ چنانچہ (مصنفہ کی رائے میں) آپؐ نے غرانیق کو بھی اپنے مذہب میں شامل کرنے کا سوچا ہوگا تاکہ قریش آپؐ کی بات کو غور سے سنا کریں۔ یہ آیات خدا کا کلام نہیں بلکہ آپؐ کی اپنی خواہش تھیں (یا پھر کسی کافر شیطان نے آپؐ کی آواز میں آواز ملا دی ہوگی، جیسا کہ اوپر علامہ شبیر احمد عثمانی کی تفسیر سے منقول اقتباس میں رائے دی گئی، مترجم)۔ بہرحال دیویوں کی مدح سرائی ایک خطا ثابت ہوئی۔ آپؐ نے اور بہت سے عربوں نے بھی اس خطا کو شیطان کی کارستانی قرار دیا۔

آنحضرتؐ نے یہ نہیں فرمایا تھا کہ "اللہ کی تین بیٹیاں" بھی اللہ کی ہم سر ہیں۔ وہ محض وسیلہ تھیں، بالکل ان فرشتوں کی طرح جن کی ثالثی کا ذکر اسی سورۃ میں آیا ہے۔[35] یہودیوں اور عیسائیوں نے اس قسم کے درمیانی وسیلوں کو ہمیشہ اپنی وحدانیت پرستی کے ساتھ مطابقت میں خیال کیا ہے۔ نئی آیات حقیقی معنوں میں نیک شگون ثابت ہوئیں اور قریش میں جیسے ایک بجلی دوڑ گئی۔ آنحضرتؐ نے آیات پڑھنے کے بعد سجدہ کیا، اور یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ قریش بھی آپؐ کے ساتھ سجدہ کر رہے تھے، اپنی پیشانیوں کو عقیدت کے ساتھ زمین پر لگائے ہوئے۔ یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح شہر میں پھیل گئی — "محمدؐ نے ہمارے دیوتاؤں کی تعریف کی ہے! انہوں نے آیت کی تلاوت میں کہا ہے کہ رفیع الشان غرانیق کی ثالثی منظور شدہ ہے۔"[36] بحران ختم ہوا۔ بزرگوں نے آنحضرتؐ سے کہا: "ہم جانتے ہیں کہ اللہ مارتا اور پیدا کرتا، تخلیق کرتا اور قائم رکھتا ہے، لیکن ہماری یہ دیویاں اس تک ہماری دعائیں پہنچاتی ہیں؛ اور چونکہ آپ نے انہیں الوہی تعظیم دی ہے، اس لیے ہم بھی آپ کے ساتھ ملنے کو تیار ہیں۔"[37]

لیکن آنحضرتؐ نے حالات کو مشکل پایا۔ یہ بہت آسان تھا۔ کیا قریش واقعی اپنے رویے میں تبدیلی لانے، غریب کو اپنی دولت میں شریک کرنے اور اللہ کے عاجز "غلام" بن کر زندگی

گزارنے پر آمادہ ہو گئے تھے؟ بظاہر تو ایسا نہیں لگتا تھا۔ آپؐ بزرگوں کی پُر مسرت باتوں سے بھی پریشان ہوئے۔ یقیناً آپؐ کا مقصد ان دیویوں کو اللہ کے ساتھ ''الوہی احترام میں شریک'' بنانا نہیں تھا۔ ہر کوئی خوشی منا رہا تھا جبکہ آپؐ گھر گئے، خود کو کمرے میں بند کر لیا اور عبادت میں کھو گئے۔ اس رات فرشتہ جبریلؑ آپؐ کے پاس تشریف لائے اور پوچھا: ''اے محمدؐ، آپ نے یہ کیا کر دیا؟''[38] اگر واقعی ایسا ہوا تھا تو مفاہمت کے لیے آپؐ کی خواہش الوہی پیغام کے عین مطابق نہیں تھی۔ خدا نے ایک نئی وحی کے ذریعہ ڈھارس بندھائی۔ تمام سابقہ پیغمبروں کو اس قسم کے حالات پیش آئے تھے۔ وحی کا مطلب جاننے میں ہمیشہ مشکل پیش آتی اور الہام کی زیادہ عمیق رو کو اپنے موضوعی خیال کے ساتھ خلط ملط کر دینا بہت آسان تھا، لیکن وحی جاری رہی: ''اور جو رسول بھیجا ہم نے یا نبی، سو جب خیال باندھنے لگا شیطان نے ملا دیا اس کے خیال میں۔ پھر اللہ مٹا دیتا ہے شیطان کا ملایا ہوا اور پھر پکی کر دیتا ہے اپنی باتیں۔''[39] یہاں ایک اہم اصول قائم ہوا۔ خدا اپنے کسی مخصوص پیغمبر پر نازل کیے جا رہے صحیفے میں رد و بدل اور ترمیم کر سکتا تھا۔ وحی کا سلسلہ آہستہ آہستہ آگے بڑھا: ہم کہہ سکتے ہیں کہ کبھی کبھی آنحضرتؐ نے اپنے نئے پیغام میں تازہ اشارے دیکھے جو آپؐ کی سابقہ بصیرتوں پر پورا اترتے تھے۔

اب حضرت محمدؐ کو نئی آیت لے کر قریش کے پاس دوبارہ جانا تھا۔ ایک مرتبہ پھر خدا نے پوچھا: ''بھلا تم دیکھو تو لات اور عزیٰ اور منات تیسرے پچھلے کو؟'' لیکن اس مرتبہ جواب تضحیک آمیز تھا۔ ''کیا تم کو ملے بیٹے اور اس کو بیٹیاں۔ یہ تقسیم تو بہت بھونڈی ہے۔ یہ سب نام ہیں جو رکھ لیے ہیں تم نے اور تمہارے باپ دادوں نے۔ اللہ نے نہیں اتاری ان کی کوئی سند محض اٹکل پر چلتے ہیں اور جو انفاس کی امنگ ہے۔''[40] یہ ایک سیدھا سیدھا طمانچہ تھا جس نے نہ صرف غرانیق کا خاتمہ کر دیا بلکہ محترم اجداد کی بھی توہین کی۔ قرآن نے ان تین دیویوں کو فرشتوں کے ساتھ جگہ دینا ناممکن کیوں پایا؟ ایک بدیہی بے ضرر عقیدت کی دوٹوک تردید کر کے امن کا موقعہ کیوں گنوایا گیا؟

احیائے اسلام کے چار برس بعد مسلمان روایتی مذہب کو سنجیدگی سے نہیں لے سکتے تھے۔ زیادہ تر قریش کے لیے اللہ اب بھی ایک دور بیٹھا اعلیٰ دیوتا تھا جو روزمرہ زندگیوں میں مداخلت نہیں کرتا تھا۔ لیکن حضرت محمدؐ کے متابعین کی نظر میں یہ بات اب درست نہ رہی۔ قرآن کی خوبصورتی نے

اللہ کو ایک زبردست اور ہمہ گیر حقیقت بنا دیا تھا۔ ان کے صحیفے کو سننے پر ''بال کھڑے ہوتے ہیں اس سے کھال پر ان لوگوں کے جو ڈرتے ہیں اپنے رب سے۔ پھر نرم ہوتی ہیں ان کی کھالیں اور ان کے دل اللہ کی یاد پر۔''(41) اللہ کے کلام کو ایک طاقتور حقیقت کے طور پر محسوس کیا گیا جو دنیا کو تہ و بالا کر سکتی تھی: اللہ نے اپنے نبیؐ کو بتایا: ''اگر ہم اتارتے یہ قرآن ایک پہاڑ پر تو تو دیکھ لیتا کہ وہ دب جاتا پھٹ جاتا اللہ کے ڈر سے۔''(42) اب اللہ اس معبود سے بالکل مختلف بن گیا جسے قریش پوجتے تھے اور دیویوں کی مدح سرائی کرنے والی آیات غلط نکلیں۔ اسلام پرانے مذہب کا ہی تسلسل نہیں تھا۔ یہ تصور کرنا مضحکہ خیز تھا کہ غرانیق کی تین مورتیں اسلام کے اللہ پر اثر انداز ہو سکتی تھیں۔

اب قرآن امتیاز واضح کرنے لگا۔ دیگر دیویاں/معبود خطرناک حد تک کمزور ہو چکے قبائلی سرداروں جیسے ہی لاچار اور غیر مؤثر تھے۔ وہ اپنی پرستش کرنے والوں کو خوراک مہیا نہیں کر سکتے تھے، جیسے کہ اللہ کیا کرتا تھا؛ اور وہ روزِ حساب اپنے عقیدت مندوں کے ایما پر ثالثی کے قابل بھی نہیں تھے۔(43) کوئی بھی اللہ کے ہم سر نہیں تھا۔

☆

غرانیق کی مدح سرائی والی آیات کی تردید کے کچھ ہی عرصہ بعد سورۃ الاخلاص نازل ہوئی:

تو کہہ وہ اللہ ایک ہے

اللہ بے نیاز ہے

نہ کسی کو جنا نہ کسی سے جنا

اور نہیں اس کے جوڑ کا کوئی۔(44)

توحید کا اصول مسلم روحانیت کا مرکز و محور بن گیا۔ یہ محض معبود کی یکتائی کی ایک مجرد مابعد الطبیعیاتی توثیق نہیں بلکہ تمام قرآنی تعلیمات کی طرح عمل کرنے کی پکار تھا۔ چونکہ اللہ بے نظیر تھا، اس لیے مسلمانوں کو صرف مورتیوں کی تعظیم سے ہی انکار نہیں کرنا بلکہ یہ یقینی بنانا بھی ضروری تھا کہ دیگر حقیقتیں انہیں صرف اور صرف اللہ سے وابستگی کی راہ سے نہ ہٹائیں: دولت، ملک، خاندان، مادی خوشحالی اور حتیٰ کہ محبت اور وطن پرستی جیسے اعلیٰ تصورات کی حیثیت بھی ثانوی ہو گئی۔ توحید تقاضا کرتی تھی کہ مسلمان اپنی زندگیوں کو متحد کریں۔ اللہ کو اپنی واحد ترجیح بنانے کی کوشش میں

مسلمانوں صحیح طور پر منظم ذات میں اللہ کی وحدانیت کی جھلک دیکھی۔ شاید اسی موقعہ پر نومبایعین کو پہلی مرتبہ ''شہادت'' دینے کا کہا گیا۔ یہ شہادت تمام مسلمان آج بھی دیتے ہیں: ''میں گواہی دیتا ہوں کہ کوئی معبود نہیں سوائے اللہ کے اور حضرت محمدؐ اس کے رسول ہیں۔''

قریش وحدانیت پرستی پر حیرت زدہ نہیں ہوئے ہوں گے کیونکہ یہ تصور ان کے لیے نیا نہیں تھا۔ انہوں نے بہت عرصہ پہلے ہی یہودیوں اور عیسائیوں کے مذہب کو اپنی روایات کے ساتھ ہم آہنگ پایا تھا اور ایک معتبر عرب وحدانیت تخلیق کرنے کے لیے حنیفوں کی کاوشوں سے بالکل پریشان نہیں ہوئے تھے۔ لیکن آنحضرتؐ کچھ مختلف کام کر رہے تھے۔ بیشتر حنیفوں نے حرم کے ساتھ گہری عقیدت قائم رکھی تھی اور سماجی نظام کی اصلاح کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ لیکن کعبہ کے اردگرد شبیہوں کو تنقید کا نشانہ بنا کر آنحضرتؐ نے تاثر دیا کہ حرم، مکہ کی معیشت کا محور، بے وقعت تھا۔ بدوی قبائل بیت اللہ کی زیارت کی غرض سے نہیں بلکہ اپنے اپنے قبائلی دیوتاؤں سے عقیدت کے باعث حج کیا کرتے تھے۔ اب قرآن نے ان بتوں کے مسلک کو سخت تنقید کا نشانہ بنایا۔[45] قریش کعبہ کا طواف کرنے کے دوران اکثر ان ''پُر جلال غرانیق'' کو پکارا کرتے تھے: اب اس دستور کو مسترد کر دیا گیا۔ طائف — جہاں اللات کی زیارت گاہ تھی — مکہ کو خوراک فراہم کرتا تھا؛ بہت سے قریش نے اس زرخیز نخلستان میں موسم گرما گزارنے کے لیے گھر بنا رکھے تھے۔ اگر وہ اپنی دیوی کی توہین برداشت کر لیتے تو طائف ان کے ساتھ دوستانہ روابط کیسے برقرار رکھ سکتا تھا؟

حضرت محمدؐ راتوں رات اُن کے دشمن بن گئے۔ قریشی سرداروں نے اپنا ایک وفد ابو طالب کے پاس بھیجا اور انہیں اپنے بھتیجے سے تعلق توڑنے کا کہا۔ کوئی بھی شخص ایک سرکاری سرپرست کے بغیر عرب میں زندگی نہیں گزار سکتا تھا۔ اپنے قبیلے سے خارج کیا گیا شخص بلا خوف قصاص مارا جا سکتا تھا۔ حضرت ابو طالب خود تو مسلمان نہیں ہوئے تھے لیکن اپنے بھتیجے (حضرت) محمدؐ سے بہت محبت کرتے تھے۔ ان کی صورت حال نہایت مشکل تھی۔ انہوں نے معاملہ رفع دفع کرنا چاہا لیکن قریش دوبارہ ایک الٹی میٹم لے کر آئے: ''خدا کی قسم، ہم اپنے باپ داداؤں کی توہین، اپنی روایات کا ٹھٹھہ اڑایا جانا اور اپنے دیوتاؤں کی بے عزتی ہونا برداشت نہیں کر سکتے۔ اگر تم ہمیں اس سے نجات نہیں دلاؤ گے تو ہم اس وقت تک تم سے لڑیں گے جب تک ہم میں سے ایک فریق ختم نہ

ہو جائے۔" حضرت ابو طالب نے حضرت محمدؐ کو بلوایا، ان سے تبلیغ کا سلسلہ بند کرنے کی درخواست کی ـــ "مجھے اور خود کو معاف رکھو۔ مجھ پر اتنا بھاری بوجھ نہ ڈالو جو میں اٹھا نہ سکوں۔" آنحضرتؐ کو لگا کہ چچا ان کا ساتھ چھوڑنے کو ہیں۔ آپؐ اشک بھری آنکھوں کے ساتھ بولے، "اے میرے چچا، اللہ کی قسم، اگر وہ دائیں ہاتھ پر سورج اور بائیں ہاتھ پر چاند بھی رکھ دیں اور مجھے اپنی راہ سے ہٹنے کا کہیں تو تب بھی تو بھی میں اس وقت تک اپنی راہ پر قائم رہوں گا جب تک اللہ مجھے کامیاب یا ہلاک نہ کر دے۔" آپؐ بھیگی آنکھوں کے ساتھ کمرے سے نکل گئے۔ چچا نے آپؐ کو واپس بلوایا اور کہا، "تم جو چاہتے ہو تبلیغ کرو۔ خدا کی قسم میں تمہیں کبھی بے سہارا نہ چھوڑوں گا۔"[46] کچھ وقت کے لیے آنحضرتؐ محفوظ ہو گئے۔ جب تک حضرت ابو طالب نے آپ کا ساتھ دیا اور مؤثر انداز میں تحفظ مہیا کرتے رہے، تب تک کسی نے بھی آپؐ کو چھونے کی بھی جسارت نہ کی۔

ابو طالب خداداد صلاحیت کے مالک شاعر تھے۔ اب انہوں نے اپنے اشعار میں ان قبیلوں کو مسترد کیا جو ضرورت کے وقت پر بنو ہاشم کا ساتھ چھوڑ گئے تھے۔ جواب میں بنو عبدالمطلب نے بنو ہاشم کے ساتھ یگانگت کا اعلان کیا، لیکن اس خوش خبری کے بعد دغا بازی کا سامنا کرنا پڑا۔ ابو طالب کا سوتیلا بھائی ابولہب حضرت محمدؐ اور وحی کا ابتدا ہی سے شدید مخالف تھا، لیکن قبیلے کے اندر پھوٹ سے بچنے کی خاطر اس نے اپنے دو بیٹوں کے رشتے آنحضرتؐ کی دو بیٹیوں رقیہؓ اور ام کلثومؓ سے کر دیے۔ اب اس نے اپنے بیٹوں کو ان خواتین کی تضحیک پر مجبور کیا۔ البتہ نفیس نوجوان عثمانؓ بن عفان عرصہ سے حضرت رقیہؓ کو پسند کرتے تھے جو مکہ کی نہایت خوبصورت دوشیزاؤں میں سے ایک تھیں۔ اب وہ حضرت محمدؐ سے ان کا ہاتھ مانگ سکتے تھے۔

قریش کے بزرگوں ـــ بالخصوص جن کے گھرانوں کے افراد مسلمان ہو گئے تھے ـــ نے اب حضرت محمدؐ کے خلاف غیض و غضب سے بھرپور مہم شروع کی۔ وہ جب بھی مسلمانوں کو 'واحد الوہی ہستی' اللہ کی تعریف کرتے سنتے تو بظاہر اپنا منہ دوسری طرف کر لیتے اور دیگر معبودوں سے مدد مانگے جانے پر زبردست مسرت کا مظاہرہ کرتے۔[47] انہوں نے مطالبہ کیا کہ ہر شخص اپنے اپنے روایتی مذہب پر قائم رہے۔ واحد مناسب کام بس یہی تھا! وحی کے متعلق تمام گفتگو ناراضگی کا باعث

تھی! سب کو آپ ؐ کا دعویٰ مسئلے کی وجہ نظر آیا۔ آخر تمام قریش میں سے ایک آپ ؐ کو الوہی پیغام کیوں موصول ہوا؟[48] آپ ؐ کو (نعوذ باللہ) مجنون اور جنات سے مغلوب قرار دیا گیا، اس کے علاوہ قریش نے آپ ؐ کو ساحر بھی کہا جو نوجوانوں کو ساحری کے ذریعے اپنے باپ داداؤں کی سنت سے گمراہ کرتا تھا۔[49] جب آپ ؐ کو اپنے دعوے سچ کرنے کے لیے ایک معجزہ دکھانے — جیسا کہ حضرت موسیٰ یا حضرت عیسیٰ نے کیا تھا — کا کہا گیا تو آپ ؐ نے انہی جیسا ایک عام انسان ہونا تسلیم کیا۔[50]

اپوزیشن راہنماؤں میں مکہ کے چند نہایت بارسوخ قبائلی سردار شامل تھے۔ اب میں سب سے نمایاں سردار اولوالعزم اور اسلام کی وجہ سے تشویش میں مبتلا ابوالحکم؛ امیہ ابن خلف اور نہایت ذہین وفطین ابوسفیان (آنحضرت ؐ کا قریبی دوست) اور اس کا سسر عتبہ ابن ربیعہ اور اس کا بھائی بھی شامل تھے۔ ابھی تک بنو عامر کے سردار سہیل ابن عمرو — ایک متقی آدمی جو آنحضرت ؐ کی طرح ہر سال غارِ حرا میں ریاضت کرنے جایا کرتا تھا — نے اپنا ذہن نہیں بنایا تھا اور آنحضرت ؐ اسے ساتھ ملانے کی توقع رکھتے تھے۔ مکہ میں کچھ نہایت بارسوخ افراد بھی اسلام کے خلاف تھے۔ جنگجو عمروؓ بن العاص اور خالدؓ ابن ولید اور — سب سے بڑھ کر ابوالحکم کا بھتیجا عمر ابن الخطاب جو پرانے مذہب پر سختی سے کاربند تھا۔ دیگر سردار محتاط انداز میں آنحضرت ؐ کے خلاف اقدامات کر رہے تھے، لیکن حضرت عمرؓ زیادہ متشدد طریقے اپنانے کو تیار تھے۔

حضرت محمد ؐ نے اب مکہ کی اسٹیبلشمنٹ کو نئے مذہب کا پیروکار بنانے کی امید چھوڑ دی اور محسوس کیا کہ ٹھکرائے ہوئے غریب لوگوں پر توجہ مرکوز کرنی چاہیے جو آپ ؐ کا پیغام شوق سے سنتے تھے۔ یہ ایک اہم موڑ تھا جو بڑے درد بھرے انداز میں قرآن میں ریکارڈ کیا گیا۔ حضرت محمد ؐ مکہ کے کچھ اکابرین کے ساتھ بحث مباحثہ میں اس حد تک منہمک تھے کہ جب ایک اندھا شخص کوئی سوال پوچھنے آیا تو آپ ؐ نے ''منہ موڑ لیا''۔[31] اللہ نے حضرت محمد ؐ کو سختی سے تنبیہ کی: پیغمبر پر لازم ہے کہ وہ برادری کے ''تمام'' افراد کو ایک جیسا احترام دے۔ اسے مروۃ کے ارسٹوکریٹک قواعد سے بالاتر ہونا چاہیے تھا: قرآن امیر اور غریب دونوں کے لیے تھا۔ ایک اندھے آدمی سے لاپروائی برتنا جانا خدا کو پسند نہ آیا۔

لفظ ''کافر'' کا ترجمہ عموماً ''ایمان نہ رکھنے والا'' کیا جاتا ہے جو نہایت گمراہ کن ہے۔[52]

آنحضرتؐ کا ابوالحکم اور ابوسفیان کے عقائد کے ساتھ کوئی جھگڑا نہ تھا۔ درحقیقت ان کی زیادہ تر دینیات درست تھی؛ مثلاً وہ قطعی طور پر یقین رکھتے کہ اللہ دنیا کا خالق اور کعبہ کا سردار ہے۔(53) مشکل یہ ہوئی کہ انہوں نے اپنے عقائد کو عملی روپ نہ دیا۔ وہ تخلیق میں اللہ کی رحمت کی نشانیوں کا درست مفہوم سمجھنے سے قاصر تھے جس کے مطابق انسانوں کو اپنے تمام معاملات میں اسی کی نقل کرنا تھی۔ زد پذیر لوگوں کی تحقیر و استحصال کی بجائے انہیں اللہ کی پیروی میں ''ان پر شفقت کا سایہ'' کرنا چاہیے تھا۔(54)

''کافر'' کا مادہ ''کفر'' (ناشکری) ہے ـــ یعنی عظیم ہمدردی اور فیاضی کے ساتھ پیش کردہ کسی چیز کا ناشکری سے انکار۔ جب اللہ نے خود کو اہلِ مکہ پر آشکار کیا تو کچھ نے تحقیر آمیز انداز میں اسے مسترد کیا۔ قرآن کافروں کو ان کے مذہبی ایقان کے فقدان کی وجہ سے برا نہیں کہتا، بلکہ ان کے تکبر پر تنقید کرتا ہے۔(55) وہ گھمنڈی اور متکبر ہیں؛ وہ خود کو غرباً، مکہ کے نسبتاً منکسر لوگوں سے بالاتر سمجھتے اور انہیں درجہ دوم کے قابلِ حقارت شہری خیال کرتے ہیں۔ وہ خود خدا کو پر منحصر محسوس کرنے کی بجائے وہ اب بھی خود کو بطور استغنا (خود کفیل) سمجھتے ہیں اور اللہ یا کسی بھی اور کے سامنے سجدہ ریز ہونے سے گریزاں ہیں۔ کافرون خود اہمیتی کے احساس سے پھولے ہوئے ہیں؛ وہ پُرغرور انداز میں اِدھر اُدھر گھومتے پھرتے، دوسروں کو تحقیر آمیز انداز میں مخاطب کرتے اور اپنا وقار خطرے میں نظر آنے پر غیظ وغضب کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ وہ اپنے اندازِ حیات کسی بھی اور شخص سے اس قدر بہتر سمجھتے ہیں کہ اپنے روایتی اندازِ حیات پر کسی بھی تنقید پر غصے میں آجاتے ہیں۔(56) حتیٰ کہ وہ کسی بھی نئی چیز پر غور کرنے کے قابل نہیں تھے: ان کے دلوں پر پردے پڑے تھے، وہ زنگ آلود اور مقفل تھے۔(58)

کافرون کی سب سے بڑی خامی جاہلیہ تھی۔ مسلمانوں نے روایتی طور پر یہ اصطلاح عرب میں قبل از اسلام عہد کے حوالے سے استعمال کی ہے، چنانچہ عموماً اس کا ترجمہ ''عہد جہالت'' کیا جاتا ہے۔ لیکن یاد رکھنا چاہیے کہ جہالت کا مادہ جُہل جبکہ جاہلیت کا مادہ جہل ہے۔ جہل کا مطلب گھمنڈ، بے جا فخر، زیادتی اور تشدد و جارحیت کا شدید رجحان ہے۔(59) جاہلی لوگ اتنے مغرور تھے کہ اسلام کی اطاعت گزاری کو قبول نہ کر سکے؛ کوئی کریم اپنے رویے میں اعتدال کیوں لاتا اور کسی

غلام (عبد) کی طرح عمل کرتے ہوئے ناک زمین پہ کیوں رگڑتا، اور پست لوگوں کو اپنے مساوی کیوں مانتا؟ مسلمانوں نے اپنے سرکردہ دشمن ابوالحکم کو "ابوجہل" کا نام اسلام سے لاعلمی کے باعث نہیں دیا ـــ وہ اسے اچھی طرح سمجھتا تھا ـــ بلکہ اس کی وجہ تسمیہ یہ تھی کہ وہ اندھے، شدید اور تباہ کن جذبے کے ساتھ مغرورانہ انداز میں اسلام کے خلاف لڑا۔ لیکن قبائلی دستور اس قدر گہرائی تک سرایت پذیر تھا (جیسا کہ ہم آگے دیکھیں گے) کہ مسلمان قبولِ اسلام کے کافی عرصہ بعد تک بھی جاہلی علامات ظاہر کرتے رہے۔ جاہلیہ کو یکدم ختم نہیں کیا جا سکتا تھا، اور یہ ایک خفتہ برائی کے طور پر موجود رہی جو کسی بھی وقت تباہی کا باعث بن سکتی تھی۔

جاہلی جذبے کے آگے سر جھکانے کی بجائے قرآن مسلمانوں پر زور دیتا ہے کہ وہ "حِلم" اختیار کریں ـــ ایک روایتی عرب وصف۔ حِلم کے حامل مرد اور عورتیں متحمل مزاج، صابر اور رحیم تھے۔[60] وہ اپنے غصے کو قابو میں رکھ سکتے اور نہایت مشکل حالات میں بھی پھٹ پڑنے کی بجائے پُرسکون رہتے؛ وہ فوراً انتقامی کارروائی نہ کرتے؛ کوئی نقصان پہنچنے پر وہ فوراً جوابی وار سے گریز کرتے، بلکہ بدلے کا معاملے اللہ پر چھوڑ دیتے تھے۔[61] حِلم نے مثبت اقدام کو بھی تحریک دلائی: حِلم پر عمل کرنے والے مسلمان کمزوروں اور بے کسوں کا خیال رکھتے، غلاموں کو آزاد کرتے، ایک دوسرے کے ساتھ صبر و ہمدردی کا مظاہرہ کرتے، اور خود بھوکے ہونے پر بھی ناداروں کو کھانا کھلاتے۔[62] مسلمانوں کے لیے لازم تھا کہ وہ ہمیشہ نرمی اور انکساری دکھائیں۔ وہ سلامتی کے حامی لوگ تھے۔ "رحیم خدا کے حقیقی خادم وہ ہیں جو زمین پر آہستگی سے چلتے ہیں اور ہمیشہ جاہلوں کا جواب سَلَم (سلامتی) میں دیتے ہیں۔"[63]

قریش کے معبودوں کی حمایت والی آیات کے بعد کافرون کے ساتھ تنازع سنگین صورت اختیار کر گیا۔ ابوجہل سامنے آنے والے کسی بھی مسلمان کو برا بھلا کہتا اور دشنام طرازی کرتا: اس نے تاجروں کو تباہی کی دھمکی دی اور "کمزور" مسلمانوں کو مارا پیٹا۔ کافرون طاقت ور سرپرستوں کے حامل مسلمانوں کو نقصان نہیں پہنچا سکتے تھے، لیکن غلاموں اور ناکافی قبائلی پشت پناہی والے افراد پر حملہ کرنے کے قابل تھے۔ جمعہ (Jumah) کا سردار امیہ ابائی سینیائی غلام بلال کو تپتی ہوئی گرم ریت پہ لٹاتا اور اس کی چھاتی پہ پتھر رکھ دیا کرتا تھا۔ حضرت ابوبکرؓ جناب بلالؓ پر یہ ظلم ہوتے

دیکھنا برداشت نہ کر پائے اور انہیں امیہ سے خرید کر آزاد کر دیا۔ انہوں نے ایک مسلمان لونڈی کو عمرؓ ابن الخطاب کے ہاتھوں تازیانے کھاتے دیکھا تو اسے بھی آزاد کروایا۔ کچھ نسبتاً نوجوان مسلمانوں کو ان کے گھر والوں نے گھر میں بند کر دیا اور بھوکا پیاسا رکھ کر راہ سے ہٹانے کی کوشش کی۔ صورت حال اس قدر خراب ہو گئی کہ آنحضرتؐ نے امت کے زیادہ کمزور ارکان کو ابائی سینیا بھیج دیا جہاں کے عیسائی حاکم نے انہیں پناہ دی۔ اب دردناک انداز میں واضح ہونے لگا تھا کہ مکہ میں مسلمانوں کا کوئی مستقبل نہیں۔

جاہلی روایات کے مطابق پرورش یافتہ مسلمانوں کے لیے حلم سے کام لینا اور طمانچے کے لیے دوسرا گال آگے کر دینا یقیناً بہت مشکل رہا ہوگا۔ حتیٰ کہ حضرت محمدؐ کو بھی کبھی کبھی صبر کا دامن تھامے رکھنے میں مشکل پیش آئی۔ ابتدائی سورتوں میں سے ایک میں آپؐ کے چچا ابولہب اور اس کی بیوی کے خلاف غصے کا اظہار کیا گیا۔ ابولہب کی بیوی آپؐ کے گھر کے باہر کانٹے بکھیر دیا کرتی تھی۔(64) ایک موقعہ پر آنحضرتؐ نے کچھ قریشیوں کو اس وقت اپنا ٹھٹھہ اڑاتے سنا جب آپؐ کعبہ کا طواف کر رہے تھے۔ آپؐ نے کچھ دیر تک تو اپنا غصہ ضبط کیا، لیکن تیسرا چکر پورا ہونے تک آپؐ کا چہرۂ مبارک غصے کے مارے سرخ ہو گیا۔ آپؐ نے طواف بیچ میں ہی چھوڑا اور کافروں کو مخاطب کر کے گرجدار آواز میں فرمایا، ''اے قریش، تم میری بات سنو گے! قسم ہے اللہ کی، جس کے قبضے میں میری جان ہے، میں تم پر تلوار لاؤں گا!'' آپؐ کے الفاظ میں ایسا جلال تھا کہ سردار خاموش ہو گئے لیکن اگلے روز ان کے اوسان بحال ہوئے۔ جب آنحضرتؐ حرم میں داخل ہوئے تو وہ فوراً آئے اور بدخواہ انداز میں آپؐ کو گھیرے میں لے کر اور بدتمیزی کرنے لگے۔ اس مرتبہ آپؐ نے غصہ نہ دکھایا بلکہ سرداروں کو دست درازی کرنے دی۔ آخر حضرت ابوبکرؓ روتے ہوئے آگے آئے، ''کیا تم ایک ایسے شخص کو مار ڈالو گے جو اللہ کو آقا مانتا ہے؟''(65)

لیکن اس قسم کا طرزِ عمل کبھی کبھی مفید کی بجائے نقصان دہ بھی ہو سکتا تھا۔ ایک روز ابوجہل صفا مدخل (حج کی رسوم میں ایک اہم مقام) کے قریب آنحضرتؐ کے پاس آیا اور آپؐ کو اس مقدس جگہ پہ دیکھ کر اس قدر برہم ہوا کہ خالصتاً جاہلی انداز میں پھٹ پڑا۔ آنحضرتؐ نے ایک مرتبہ پھر صبر کیا اور چپ چاپ بیٹھ کر گھٹیا اور توہین آمیز الفاظ سنتے رہے۔ آخر کار ابوجہل نے الفاظ کے تیر

برسانا بند کیے اور حرم میں دیگر سرداروں کے پاس چلا گیا، جبکہ آپؐ خاموشی سے اور اداسی کے عالم میں گھر کی جانب روانہ ہوئے۔ لیکن اس شام آپؐ کے چچا حضرت حمزہؓ (جو شکار پر گئے ہوئے تھے) کو سارا حال معلوم ہوا اور وہ بہت غضبناک ہوئے۔ حمزہؓ فوراً ابوجہل کو ڈھونڈنے نکل کھڑے ہوئے اور ملنے پر اسے اپنی کمان سے ضرب لگا کر بولے، ''کیا تم تب بھی اس کی توہین کرو گے جب میں اس کے مذہب کا پیروکار بن جاؤں گا؟ اگر ہمت ہے تو مجھ پر ہاتھ اٹھاؤ!'' مکہ میں اپنی طاقت کی وجہ سے مشہور حمزہؓ کی دشمنی مول لینے سے گریزاں ابوجہل نے اپنے ساتھیوں کو آگے بڑھنے سے روکا اور تسلیم کیا کہ اس نے آنحضرتؐ کی توہین کی تھی۔ (66)

حمزہؓ سچے مسلمان بن گئے، لیکن آنحضرتؐ اس انداز میں اپنے چچا کے قبول اسلام کے خواہش مند نہیں تھے۔ 616ء کے اواخر میں ایک اور بھی زیادہ حیرت انگیز تبدیلئ مذہب واقع ہوئی۔ عمر ابن الخطاب نے حضرت محمدؐ کو (نعوذ باللہ) قتل کرنے کا ارادہ کیا۔ وہ شمشیر برہنہ ہاتھ میں لیے کوہِ صفا کے دامن میں واقع ایک گھر کی جانب گئے جہاں آپؐ دوپہر گزار رہے تھے۔ انہیں علم نہ تھا کہ ان کی بہن فاطمہؓ بنت الخطاب اور بہنوئی بھی خفیہ طور پر مسلمان بن چکے تھے۔ حضرت عمرؓ کے قریب نہ ہونے کی تسلی کر کے انہوں نے چند پڑھے لکھے مسلمانوں کو ایک تازہ تازہ نازل شدہ سورۃ پڑھنے کے لیے بلوایا تھا۔ لیکن کوہِ صفا کی جانب جاتے ہوئے حضرت عمرؓ کو راستے میں ایک اور مسلمان نے روکا جس نے آنحضرتؐ کی جان کو لاحق خطرے کے پیش نظر حضرت عمرؓ کو اطلاع دی کہ ان کی اپنی بہن اور بہنوئی نے بھی اسلام قبول کر لیا ہے۔ حضرت عمرؓ گھر کی جانب گئے اور بالائی منزل پر ایک کھڑکی سے آتی ہوئی تلاوتِ قرآن کی آواز سن کر مبہوت رہ گئے۔ وہ کمرے میں داخل ہو کر گرجے، ''یہ کیا بکواس ہے!'' تلاوت کرنے والے خوف کے مارے بھاگ کھڑے ہوئے اور افراتفری میں مسودہ وہیں چھوڑ گئے۔ حضرت عمرؓ نے اپنی بہن کو دھکا دے کر زمین پہ گرا دیا لیکن بہن کا خون بہتا دیکھ کر نادم ہوئے، مسودہ اٹھایا اور سورۃ پڑھنے لگے۔ حضرت عمرؓ عکاظ کے مقابلۂ شاعری میں ایک منصف کے طور پر فرائض انجام دیا کرتے تھے۔ انہوں نے فوراً ہی محسوس کر لیا کہ وہ کوئی قطعی غیر معمولی چیز پڑھ رہے ہیں۔ یہ روایتی عرب شاعری سے بالکل مختلف چیز تھی۔ قران کی خوبصورتی نے فوراً ان کا غصہ زائل کر دیا اور ان کے اندر بہت گہرائی میں دفن جذبۂ قبولیت کو

تحریک دلائی۔ پھر بھی انہوں نے اپنی تلوار نکالی اور گلیوں میں سے ہوتے ہوئے حضرت محمدؐ کی جانب روانہ ہوئے۔ آپؐ نے پوچھا، ''ابن الخطاب تم کیا لائے ہو؟'' حضرت عمرؓ نے جواب دیا، ''میں خدا اور اس کے پیغمبر اور خدا کی جانب سے اس کے لائے ہوئے پیغام پر ایمان لانے آیا ہوں۔'' آنحضرتؐ نے اس قدر بلند آواز میں شکر ادا کیا کہ گھر میں موجود ہر شخص — جو خوف کے مارے دبک گئے تھے — کو یقین آ گیا کہ کیا واقعہ پیش آیا ہے۔ (67)

ابن اسحٰق نے حضرت عمرؓ کے قبول اسلام کا ایک اور کم ڈرامائی مگر مساوی اہمیت کا حامل واقعہ ریکارڈ کیا ہے۔ وہ ایک شام کو بازار میں اپنے دوستوں کے ساتھ محفل نا و نوش منانے کے لیے نکلے، لیکن دوست آنے میں ناکام رہے تو انہوں نے اس کی بجائے طواف کا قصد کیا۔ حرم بالکل ویران پڑا تھا۔ صرف آنحضرتؐ کعبہ کے قریب کھڑے اکیلے ہی قران کی تلاوت کر رہے تھے۔ حضرت عمرؓ نے سوچا کہ قرآن سننا چاہیے، لٰہذا وہ غلاف کعبہ کی آڑ میں آہستہ آہستہ کھسکتے ہوئے آپؐ کے سامنے پہنچ گئے۔ جیسا کہ انہوں نے بعد میں بتایا، ''غلاف کعبہ کے سوا ہمارے درمیان اور کوئی چیز نہ تھی۔'' تب قرآن کی طاقت نے اپنا اثر دکھایا: ''جب میں نے قرآن سنا تو میرا دل موم ہو گیا اور میں رونے لگا۔ تب میں اسلام میں داخل ہوا۔'' (68) حضرت عمرؓ کا قبول اسلام مخالفین پر ایک کاری وار تھا، لیکن وہ ان کو کوئی گزند نہ پہنچا سکے کیونکہ انہیں اپنے قبیلے کا تحفظ حاصل تھا۔

اب ابو جہل نے بنو ہاشم اور بنو المطلب سے بائیکاٹ کر دیا: کوئی بھی ان کے ساتھ شادی یا تجارت نہیں کر سکتا تھا، حتیٰ کہ انہیں اناج فروخت کرنے کی اجازت بھی نہیں تھی۔ بنو ہاشم اور بنو المطلب کے تمام مسلم و غیر مسلم ارکان حضرت ابو طالبؓ کی گلی میں منتقل ہو گئے۔ جب آنحضرتؐ کا گھرانہ پہنچا تو ابو لہب اور اس کے خاندان نے عبد شمس کے علاقے میں رہائش اختیار کر لی۔ بائیکاٹ کا مقصد دونوں قبیلوں کو فاقوں سے دوچار کرنا نہیں بلکہ قبیلے سے علیحدگی کے نتائج سے آگاہ کرنا تھا۔ اگر آنحضرتؐ مکہ میں مذہبی زندگی سے گریز کرنا چاہتے تھے تو معیشت سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے تھے۔ (69) پابندی تین سال بعد ختم ہو گئی۔ بالخصوص ان لوگوں نے اسے ناپسند کیا جن کے رشتہ دار بنو ہاشم اور بنو المطلب دونوں میں موجود تھے، اور وہ انہیں فاقوں مرتا نہیں دیکھ سکتے تھے۔

حضرات ابوبکرؓ و عمرؓ جیسے مسلمان — جو متاثرہ قبیلوں میں سے نہیں تھے — ہر ممکن حد تک رسد فراہم کرتے رہے۔ ایک مکی شخص باقاعدگی سے اونٹ پر سامان لادتا، رات کے وقت اسے ابوطالب کے کوچے میں لے جاتا، اونٹ کی پچھلی ٹانگوں پہ زور سے چابک مارتا اور گلی کی جانب بھگا دیتا۔ ایک موقعہ پر ابوجہل نے حضرت خدیجہؓ کے ایک بھتیجے کو پکڑا جو گندم کا تھیلا لیے کوچے کی طرف جا رہا تھا۔ جلد ہی ایک بحث شروع ہو گئی۔ ایک اور قریشی نے بھی بحث میں حصہ لیا، نفرت کا اظہار کیا کہ ابوجہل ایک ایسے آدمی کو روک رہا تھا جو اپنی خالہ کو خوراک دینے جا رہا تھا، اور اسے زوردار ضرب لگائی جس کے باعث وہ زمین پہ جا گرا۔

اس پابندی کے دوران قرآن نے مسلمانوں کو یاد دلایا کہ دیگر پیغمبروں — یوسفؑ، نوحؑ، یونسؑ، موسیٰؑ اور عیسیٰؑ — نے بھی اپنے لوگوں کو طرزِ عمل کی اصلاح کرنے کو کہا تھا، اور جب انہوں نے انکار کیا تو ان کی بستیاں اجڑ گئیں، کیونکہ وہ کائنات کے اساسی اصولوں کی مطابقت میں عمل نہیں کر رہے تھے۔[70] جانوروں، مچھلیوں یا پودوں — جو جبلی طور پر ان بنیادی قوانین کی اطاعت کے باعث فطری مسلمان تھے — کے برعکس انسان آزاد ارادہ رکھتے ہیں۔[71] کمزور کو دبانے اور غریبوں کو اپنے مال میں شریک کرنے سے انکار کر کے انہوں نے خدا کے قانون کی خلاف ورزی کی۔ ان کا طرزِ عمل مچھلی کے خشکی پر زندہ رہنے کی کوشش کرنے جیسا تھا۔ تباہی ناگزیر تھی لیکن قرآن مسلمانوں کو صبر کی تلقین اور دشمنوں سے ذاتی انتقام لینے سے منع کرتا رہا۔

کچھ ایک قریش بھی امن کے لیے بے قرار تھے۔ پابندی عائد ہونے سے کچھ ہی عرصہ بعد ایک چھوٹا سا وفد حضرت محمدؐ کے پاس آیا جس کی قیادت ایک محترم بزرگ کر رہا تھا۔ اس نے ایک سمجھوتہ تجویز کیا: سارا شہر ایک سال اللہ اور دوسرے سال دیگر دیوتاؤں کی پرستش کر سکتا تھا، لیکن آپؐ نے یہ تجویز قبول نہ کی۔ اس کی بجائے سورۃ الکفرون نے پُر امن بقائے باہمی کا مشورہ دیا:

تو کہہ دے اے منکرو (کفرون)

میں نہیں پوجتا جس کو تم پوجتے ہو

اور نہ تم پوجو جس کو میں پوجوں

اور نہ مجھ کو پوجنا ہے اس کا جس کو تم نے پوجا

اور نہ تم کو پوجنا ہے اس کا جس کو میں پوجوں
تم کو تمہاری راہ اور مجھ کو میری راہ۔[72]

لوگ مختلف چیزوں کو پوجتے ہیں، ''دین میں کوئی جبر نہیں'' ہونا چاہیے (**لا اکراہ فی الدین**)۔[73] دین کا مطلب ''حساب'' کے علاوہ ''مذہب''، ''زندگی کی راہ'' یا ''اخلاقی قانون'' بھی ہے۔ ہر شخص کا اپنا اپنا دین تھا اور جبر یا زبردستی کی کوئی ضرورت نہ تھی۔

آخر کار خونی قرابت داری نے بائیکاٹ ختم کرا دیا۔ قریشی اسٹیبلشمنٹ کے چار افراد ــــ جن کے رشتہ دار بنو ہاشم اور بنو المطلب میں موجود تھے ــــ نے پابندی اٹھانے کی درخواست کی اور ابوجہل کے شدید احتجاج کے باوجود دیگر سردار مان گئے۔ مسلم امت یقیناً بہت خوش ہوئی ہوگی۔ یہ خبر سن کر ابائی سینیا گئے ہوئے کچھ تارکین وطن لوٹ آئے۔ انہیں یقین تھا کہ سخت دور گزر چکا تھا، لیکن ان کی رجائیت حد سے بڑھ کر تھی۔ 619ء کے اوائل میں حضرت خدیجہؓ فوت ہوگئیں۔ وہ معمر ہو چکی تھیں اور خوراک کی قلت نے ان کی صحت بہت خراب کر دی تھی۔ وہ آنحضرتؐ کی قریب ترین ساتھی تھیں ــــ اور حضرت ابوبکرؓ یا پُر جوش حضرت عمرؓ سمیت کوئی بھی آپؐ کو اس قسم کی قربت مہیا نہ کر سکا۔ سوانح نگاروں نے سن 619ء کو ''عام الحزن'' یعنی غم کا سال قرار دیا۔ کچھ ہی عرصہ بعد ایک اور موت نے اور بھی زیادہ دھچکا پہنچایا۔ حضرت ابوطالب مالی طور پر تباہ ہو چکے تھے، اور بائیکاٹ نے ان کی صحت پر بھی اثر ڈالا ہوگا۔ سال کے اواخر میں وہ بیمار ہوئے اور خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ ابولہب بنو ہاشم کا نیا سردار بنا۔
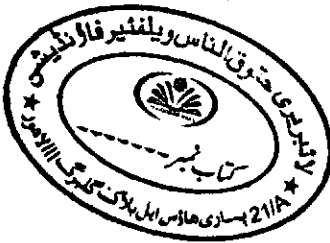
باب 3

ہجرت

مکہ میں ہر شخص جان گیا کہ اب حضرت محمدؐ زد پذیر ہو گئے ہیں۔ ابولہب حضرت محمدؐ سے نفرت نہیں کرتا تھا: کسی سردار سے توقع کی جاتی تھی کہ وہ اپنے قبیلے کے تمام افراد کو تحفظ دے گا، اور اپنے اقتدار کی ابتدا میں ہی ایسا کرنے میں ناکامی کمزوری کی علامت ہوتی۔ لیکن یہ امر واضح تھا کہ اس نے سرپرستی میں بغض سے کام لیا۔ آنحضرتؐ کے پڑوسیوں نے آپؐ کو تنگ کرنے کے لیے مختلف حربے آزمائے: نماز کے دوران سجدے میں جانے پر آپؐ کے اوپر اوجڑی ڈالی اور ایک مرتبہ ہنڈیا میں بھی غلاظت ڈال دی۔ ایک مرتبہ جب آپؐ شہر میں سے گزر رہے تھے تو ایک قریشی نے آپؐ پر غلاظت پھینکی۔ بیٹی حضرت فاطمہؓ نے آپؐ کو اس حالت میں دیکھا تو اشکبار ہوئیں۔ آنحضرتؐ نے اپنے لباس سے گندگی صاف کرتی ہوئی بیٹی کو پیار کیا اور تسلی دی، ”روؤ مت، میری بیٹی۔ اللہ تمہارے باپ کی حفاظت کرے گا۔“ اور پھر اپنے آپ سے بات کرنے کے انداز میں

فرمایا، ''ابو طالب کی زندگی میں قریش نے کبھی میرے ساتھ ایسا سلوک نہیں کیا تھا۔''[1]

آپؐ کی کمزوری نے نسبتاً زیادہ زد پذیر مسلمانوں کی حیثیت کو اور بھی متاثر کیا۔ مثلاً بائیکاٹ نے حضرت ابوبکرؓ کو مالی لحاظ سے تباہی کے دہانے پر پہنچا دیا تھا۔ وہ جمحہ قبیلے کے علاقے میں رہتے تھے اور سردار امیہ ابن خلف (جو حضرت بلالؓ کو تپتی ریت پر لٹایا کرتا تھا) اب حضرت ابوبکرؓ کے ساتھ بھی خراب سلوک کے لیے خود کو آزاد محسوس کرنے لگا۔ اس نے حضرت ابوبکرؓ کو بیماری کی حالت میں تیز دھوپ میں چھوڑ دیا۔ ان کا قبیلہ تیم اتنا کمزور تھا کہ ان کو تحفظ نہیں دے سکتا تھا۔ چنانچہ حضرت ابوبکرؓ مکہ کے دگرگوں حالات دیکھ کر ابائی سینیا میں تارک وطن مسلم برادری کی جانب روانہ ہو گئے۔ لیکن راستے میں ان کی ملاقات قریش کے بدوی اتحادیوں میں سے ایک ابن دغنہ سے ہوئی جو صورتحال جان کر بہت دہشت زدہ ہوا۔ اس نے حضرت ابوبکرؓ سے واپس مکہ چلنے کو کہا اور باقاعدہ اپنی امان میں لے کر مکہ آیا۔ چونکہ قریشی اسٹیبلشمنٹ ابن دغنہ کو ساتھ ملانے کو بے قرار تھی۔ اس لیے وہ مفاہمت پر تیار ہو گئے، لیکن شرط عائد کی کہ ابوبکرؓ کھلِ عام تلاوتِ قرآن یا عبادت نہیں کریں گے۔ قریش نے اس کی وجہ یہ بتائی کہ حضرت ابوبکرؓ اپنی مقبولیت کے بل بوتے پر نوجوانوں کو روایتی مذہب سے ہٹا دیں گے۔ چنانچہ حضرت ابوبکرؓ تن تنہا عبادت کرتے۔ انہوں نے اپنے گھر کے سامنے ایک چھوٹی سی مسجد (جائے سجدہ) بنالی۔

لیکن صورت حال واضح طور پر غیر تسلی بخش تھی۔ آنحضرتؐ نے طائف کے خوشگوار و زرخیز نخلستان میں اپنے لیے ایک نیا سرپرست تلاش کرنے کی کوشش کی مگر بے سود، کیونکہ بنو ثقیف آپؐ کی جانب سے اپنی دیوی اللات کو مسترد کیے جانے پر ناراض تھے۔ آپؐ نے ثقیف کے تین راہنماؤں سے ملاقات کی، انہیں اپنا مذہب قبول کرنے کی دعوت دی اور ان کی سرپرستی قبول کی، لیکن وہ آپؐ کی مستقل مزاجی پر اس قدر برافروختہ ہوئے کہ گلیوں میں اپنے غلاموں کو آپؐ کے پیچھے لگا دیا۔ آپؐ نے مکہ کے سرکردہ کافروں میں سے ایک عتبہ ابن ربیعہ کے باغ میں پناہ لی جس کا طائف میں گرمائی گھر تھا اور جس کے بھائی شیبان نے حضرت محمدؐ کو غلاموں سے بچ کر بھاگتے دیکھا۔ لیکن وہ ایک ہم قبیلہ شخص کو ثقیف کے سپرد نہیں کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ انہوں نے آپؐ کی جائے پناہ کے متعلق مطلع کی بجائے ایک غلام کے ہاتھ آپؐ کو انگوروں کی پلیٹ بھجوائی۔

حضرت محمدؐ باغ میں ایک درخت کے پیچھے پناہ گزین تھے اور آپؐ کو کسی بہتری کی امید نہ تھی۔ عرب لوگ مشکل وقت میں کسی دیوتا یا جن کی پناہ لیا کرتے تھے، چنانچہ آنحضرتؐ نے اللہ سے پناہ مانگی:

> خداوند، میں اپنی کمزوری اور لوگوں کے مقابلہ میں اپنی مجبوری کی تجھ سے شکایت کرتا ہوں۔ اے ارحم الرحمٰن، تو کمزوروں کا رب ہے، تو مجھے کس کے سپرد کرتا ہے؟ کسی اجنبی کے جو مجھ پر ظلم کرے یا تو نے میرے معاملہ کو کسی دشمن کے حوالے کر دیا ہے۔ اگر تو مجھ سے ناراض نہیں ہے تو ان مصائب کی میں پروا نہیں کرتا۔ تیری حمایت میرے لیے بہت زیادہ وسیع ہے۔ میں تیرے اس نور کا واسطہ دے کر جس سے تمام تاریکیاں روشن ہو گئی ہیں اور جس پر دنیا اور آخرت میں کامیابی کا مدار ہے، اس بات سے پناہ مانگتا ہوں کہ تیرا غصہ اور غضب مجھ پر نازل ہو۔ بے شک تو جب تک چاہے تجھے عتاب کرنے کا حق ہے اور ہر قسم کی طاقت وقوت صرف تجھے حاصل ہے۔(2)

ابن اسحٰق کا حضرت محمدؐ کی ذہنی کیفیت اور خیالات کا اس قدر قریبی بیان دینا غیر معمولی ہے۔ یہ روحانی سچائی کے لمحے کی جانب اشارہ کرتا ہے۔ اسلام کے اس فعل میں آنحضرتؐ نے پہلے کی نسبت کہیں زیادہ بھرپور انداز میں محسوس کیا کہ آپؐ کو اللہ کے سوا کوئی بھی تحفظ حاصل نہیں۔

لگتا تھا کہ اللہ نے آپؐ کی دعا سن لی کیونکہ ابھی آپؐ نے یہ الفاظ مکمل ہی کیے تھے اور عتبہ کا غلام لڑکا عدس انگوروں کی طشتری لیے آن پہنچا۔ وہ ایک عیسائی تھا اور آنحضرتؐ یہ جان کر مسرور ہوئے کہ وہ حضرت یونسؑ کے شہر نینوا سے تعلق رکھتا تھا۔ آپؐ نے عدس کو بتایا کہ پیغمبر ہونے کے ناتے حضرت یونسؑ آپؐ کے بھائی تھے۔ عدس اس قدر مغلوب بہ جذبات ہوا (جس پر عتبہ کو بہت غصہ آیا) کہ آنحضرتؐ کے سر، ہاتھوں اور پیروں کو چومنے لگا۔ عتبہ دور کھڑا دیکھ رہا تھا۔ ایک اہلِ الکتاب کے ساتھ اس غیر متوقع ملاقات کے بعد آنحضرتؐ خود کو کم تنہا محسوس کرنے لگے۔ آپؐ کو

یاد آیا کہ اگرچہ عربوں نے آپ کو مسترد کر دیا تھا، لیکن عرب سے باہر کی دنیا میں بے شمار عبادت گزار موجود تھے جو آپؐ کے مشن کو سمجھ سکتے تھے۔ گھر کی جانب سفر شروع کرنے پر آپؐ نے شادمانی محسوس کی اور نخلہ کے چھوٹے سے نخلستان میں عبادت کرنے رکے جہاں ''غیر مرئی ہستیوں'' (جنات) کے ایک گروہ نے آپؐ کی آواز سنی۔ لفظ سے مراد محض عرب کی متلون مزاج روحیں ہی نہیں؛ یہ لفظ اجنبیوں اور انجانے افراد کے لیے بھی استعمال ہو سکتا ہے۔ قرآن نشاندہی کرتا ہے کہ نخلہ میں نظر سے اوجھل رہنے اور حضرت محمدؐ کے منہ سے قرآن سننے والے مسافر غالباً یہودی ہوں گے۔ وہ عربی صحیفے کی خوب صورتی اور فصاحت سے اس قدر متاثر ہوئے کہ گھر واپس پہنچ کر اپنے لوگوں کو بتایا کہ انہوں نے ''سنی ایک کتاب جو اتری ہے موسیٰ کے بعد سچا کرنے والی سب اگلی کتابوں کو، سجھاتی ہے سچا دین اور ایک راہ سیدھی۔''[3]

حضرت محمدؐ کے فکری افق وسعت اختیار کرنے لگے تھے۔ آپؐ کو یقین تھا کہ محض اپنے قبیلے کے لیے ''نذیر'' (خبردار کرنے والا) بنا کر بھیجے گئے ہیں اور یہ کہ آپؐ صرف اہلِ مکہ کے لیے پیغمبر ہیں، لیکن اب آپ اہل الکتاب کی طرف بھی دیکھنے لگے جو سابقہ الہامی کتابوں کو مانتے تھے۔ اس خیال سے ملنے والے اعتماد کے باوجود آپؐ بے چین رہے۔ اگر کافروں کو معلوم ہو جاتا کہ آپؐ نے طائف میں مددگار تلاش کرنے کی کوشش کی ہے تو آپؐ کی صورتحال اور بھی زیادہ مخدوش ہو جاتی؛ چنانچہ مکہ میں داخل ہونے سے قبل آپؐ نے تین قبائلی سرداروں کو سرپرستی فراہم کرنے کا پیغام بھیجا۔ دو نے انکار کر دیا، لیکن تیسرے قبیلے نوفل کے سردار معطم — جو بائیکاٹ ختم کرانے کی مہم مین بھی شامل تھا — نے آپؐ کو تحفظ دینے کا وعدہ کیا۔ اب آپؐ بحفاظت گھر واپس آسکتے تھے۔

لیکن یہ ایک طویل المیعاد حل نہیں ہو سکتا تھا۔ آنحضرتؐ کے لیے کسی نہ کسی طرح قریش کو ساتھ ملانا ضروری تھا۔ 619ء میں آپ حج کے موقعہ پر لگنے والے تجارتی میلوں میں آئے ہوئے تاجروں اور زائرین میں تبلیغ کرنے لگے۔ شاید حضرت ابوبکرؓ کی طرح آپؐ کو بھی ایک بدو سرپرست مل جاتا، اور اگر قریشی امرا آپؐ کو اپنے بدو اتحادیوں کے ہاں تعظیم ملتے دیکھتے تو آپؐ کے ساتھ سمجھوتہ بھی کر لیتے۔ لیکن بدو زائرین نے معاندانہ اور توہین آمیز رویہ اپنایا۔ انہیں سب سے کم دلچسپی اس مذہب میں تھی جو عاجزی و انکساری کا درس دیتا تھا۔ آنحضرت نے محسوس کیا کہ

آپ کے وسائل ابھی ختم نہیں ہوئے تھے۔ آپ اب بھی حضرت خدیجہؓ کے لیے سوگوار تھے؛ مکہ میں آپؐ کی حیثیت مخدوش تھی؛ اور سات سال تک تبلیغ کرنے کے بعد بھی آپؐ کوئی حقیقی پیش رفت نہ دکھا پائے تھے۔ تاہم، اپنے کیریئر کے اس نہایت خراب دور میں بھی آپؐ کو اپنی زندگی کا عظیم ترین ذاتی باطنی تجربہ ہوا۔

آپؐ حرم کے قریب اقامت پذیر اپنے ایک کزن سے ملاقات کرنے گئے اور رات بھر کعبہ کے قریب عبادت کرنے کا فیصلہ کیا۔ حرم کے شمال مغربی کونے میں ایک چاردیواری کے اندر بیٹھے بیٹھے آپؐ کی آنکھ لگ گئی (اس احاطے میں حضرت اسمٰعیل اور حضرت ہاجرہ کی قبریں تھیں)۔ تب آپؐ کو محسوس ہوا کہ حضرت جبرئیل نے آپؐ کو جگایا ہے اور اپنے ہمراہ یروشلم — یہودیوں اور عیسائیوں کا مقدس شہر — لے کر گئے ہیں۔ قرآن مجید کی مندرجہ ذیل آیات میں یہ تجربہ بیان کیا گیا ہے:

> پاک ذات ہے جو لے گیا اپنے بندہ کو راتوں رات مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک
> جس کو گھیر رکھا ہے ہماری برکت نے تا کہ دکھلائیں اس کو کچھ اپنی قدرت کے
> نمونے۔ وہی ہے سننے والا دیکھنے والا۔[4]

یروشلم کا ذکر نام سے نہیں آیا، لیکن بعد کی روایت نے ''المسجد الاقصیٰ'' کو اہل الکتاب، یعنی یہودیوں اور عیسائیوں کا مقدس شہر بتایا۔ مورخ طبری کے مطابق آنحضرتؐ نے اپنے صحابہؓ کو بتایا کہ ایک مرتبہ حضرت جبرئیلؑ اور حضرت میکائیلؑ انہیں ان کے ''اجداد'' سے ملوانے لے گئے تھے: آدمؑ (پہلے آسمان پر) اور ابراہیمؑ سے (ساتویں آسمان پر)۔ آپؐ نے اپنے ''بھائیوں'' سے بھی ملاقات کی: عیسیٰؑ، نوحؑ، ہارونؑ، موسیٰؑ اور یوسفؑ۔ قرآن نے یہ بھی دعویٰ کیا کہ آنحضرتؐ نے بیری کے قریب ایک رویا بھی دیکھا جو انسانی علم کی حد کی نشاندہی کرتا ہے:

> اس کو اس نے دیکھا ہے اترتے ہوئے ایک بار اور بھی
> بسدرۃ المنتہیٰ کے پاس۔
> جب چھا رہا تھا اس بیری پر جو کچھ چھا رہا تھا

بہکی نہیں نگاہ اور نہ حد سے بڑھی

بے شک دیکھے اس نے اپنے رب کے بڑے نمونے۔ (6)

قرآن اس رویا کے بارے میں زیادہ تفصیل نہیں بتاتا۔ آپؐ نے صرف خدا کے نمونے اور نشانیاں دیکھیں۔۔۔ بذاتِ خود خدا کو نہیں؛ اور بعد کے صوفیا نے اس ماورائی بصیرت کے پیراڈاکس کو اجاگر کیا جس میں حضرت محمدؐ نے الوہی جوہر کو دیکھتے ہوئے بھی نہ دیکھا۔

بعدازاں مسلمانوں نے ان جزوی حوالوں کو جوڑ کر ایک مربوط کہانی تشکیل دی۔ غالباً سات آسمانوں سے گزر کر خدا کے تخت تک پہنچنے کے حوالے سے یہودی صوفیا کی کہانیوں کے زیر اثر انہوں نے تصور کیا کہ پیغمبر اسلام بھی اسی قسم کے سفر پہ گئے ہوں گے۔ اس ''رات کے سفر'' (اسراء) کا پہلا بیان آٹھویں صدی عیسوی کے سیرت نگار ابن اسحٰق کے ہاں ملتا ہے۔ اس طویل کہانی میں حضرت جبرئیلؑ نے آپؐ کو ایک آسمانی گھوڑے (براق) پہ سوار کروایا اور رات کے اندھیرے میں یروشلم لے گئے جہاں وہ قدیم یہودی معبد کی جائے وقوع (مسجد اقصیٰ) پر اترے۔ وہاں حضرات ابراہیمؑ، موسیٰؑ مسیحؑ اور تمام سابقہ پیغمبروں نے آپؐ کا استقبال کیا اور تبلیغ کی دعوت دی۔ بعدازاں تمام پیغمبروں نے مل کر عبادت کی۔ تب ایک سیڑھی لائی گئی اور آنحضرتؐ و حضرت جبرئیلؑ پہلے آسمان پر گئے۔ ہر آسمان پر کسی نہ کسی سابقہ عظیم پیغمبر نے آپؐ سے ملاقات اور بات چیت کی۔ پہلے آسمان کے سردار حضرت آدمؑ تھے جہاں آنحضرتؐ کو جہنم کا منظر دکھایا گیا؛ حضرت عیسیٰؑ اور یوحنا باپٹسٹ دوسرے آسمان پر تھے؛ حضرت یوسفؑ تیسرے پر؛ نوحؑ چوتھے پر؛ حضرت موسیٰؑ و ہارون پانچویں اور چھٹے پر؛ اور آخرکار ساتویں آسمان پر آنحضرتؐ کی ملاقات حضرت ابراہیمؑ سے ہوئی۔ یہ الوہی اقلیم کی دہلیز تھی۔

بیش تر مصنفین نے از راہِ احترام اللہ کا حتمی نظارہ قلم زد نہیں کیا کیونکہ یہ ناقابل بیان تھا۔ آنحضرتؐ کو عام انسانی تصورات ترک کر کے، بیری کے درخت۔۔۔ دنیوی علم کی حد۔۔۔ سے آگے جانا پڑا۔ حتیٰ کہ آخری مرحلے پر حضرت جبرئیلؑ بھی آپؐ کے ہمراہ نہ جا سکے۔ آپؐ نے سب کچھ اور۔۔۔ جیسا کہ بعد کے صوفیا نے کہا۔۔۔ حتیٰ کہ اپنی ذات کو بھی خدا میں سمو دیا۔ شبینہ سفر اور اسراع

کی کہانی ایسا واقعہ ہے جو کچھ اعتبار سے صرف ایک مرتبہ ہوا، لیکن جو ہر وقت بھی ہوتا ہے۔ یہ اسلام کے کامل اقدام کا نمائندہ ہے۔ ایک ایثار ذات جو ہستی کے ماخذ میں واپسی بھی تھی۔ کہانی مسلم روحانیت کا پیراڈائم (سمت نما) بن گئی۔ اس نے تمام بنی نوع انسان کے لیے مثالی راہ بتائی، اور انا پرستی کی حدود بھی۔

رویا کا نتیجہ ایک قرآنی الہام نہیں تھا: یہ پیغمبر اسلام کا اپنے لیے ذاتی تجربہ تھا، لیکن ابتدائی سیرت نگاروں نے اسے آنحضرتؐ کی زندگی کے اس مخصوص موڑ پر بیان کیا۔ لہٰذا یہ ان خارجی واقعات کے عمیق ترین ذیلی متن پر خوبصورت تفسیر ہے۔ آنحضرتؐ اپنے بس سے باہر حالات کے باعث مکہ کو اور ہر جانی پہچانی چیز کو چھوڑنے پر مجبور ہوئے۔ کم از کم کچھ عرصہ کے لیے۔ آپؐ کو اپنی توقعات سے بالاتر اور مقبول معاصر نظریات سے ماورا ہونا پڑا۔ روایتی عرب قصے میں شاعر عموماً اپنی گمشدہ محبوبہ کے ''ذکر'' سے آغاز کرتا جو اپنے قبیلے کے ہمراہ اس سے دور جا رہی ہوتی تھی۔ اگلے باب میں گویا اپنی یادوں کا حصار توڑ کر ''شبینہ سفر'' پر روانہ ہوتا اور اپنے اونٹ پر سٹیپیوں کے پار جاتا۔ ایک دہشت ناک سفر جس کے دوران وہ اپنے فانی پن سے دوچار ہوتا۔ آخر میں شاعر اپنے قبیلے میں واپس آ جاتا۔ قصے کے آخری حصے میں وہ اپنے لوگوں کی پیروئ اقدار پر فخر مندانہ انداز میں شیخی بگھارتا، جنگ میں ان کی شجاعت اور طاقت کا ذکر کرتا اور اپنی بقاؑ کے لیے خطرہ بننے والے تمام اجنبیوں کے خلاف پیہم لڑائی کے متعلق بتاتا تھا۔[7] آنحضرتؐ کے شبینہ سفر میں مروۃ کی یہ تمام اقدار اُلٹ گئیں۔ آپؐ اپنے قبیلے میں واپس آنے کی بجائے اس سے دور یروشلم میں گئے؛ جاہلیہ کے مخصوص متعصبانہ انداز میں قبائلی شناخت پر زور دینے کی بجائے آپؐ نے اپنی انا کو قربان کیا۔ جنگ و جدل میں خوشی منانے کی بجائے آپؐ کے سفر نے ہم آہنگ، قرابتی گروہ سے ماورائیت اور بقیہ انسانیت کے ساتھ یگانگت کو اجاگر کیا۔

اسراع کی کہانی حجاز کے عربوں۔ جو خود کو الوہی منصوبے میں شمولیت سے محروم محسوس کرتے تھے۔ کو وحدانیت پرست خاندان کے قلب میں لانے کے لیے حضرت محمدؐ کی تمنا کی غماز ہے۔ یہ اجتماعیت پسندی کی کہانی ہے۔ آنحضرتؐ مکہ کی بت پرستی کو ترک کر رہے تھے کیونکہ یہ جاہلیہ کی نخوت و تکبر میں غرق ہو کر رہ گئی تھی۔ یروشلم میں آپؐ کو پتا چلا کہ خدا کی جانب سے مختلف اقوام پر

مبعوث کیے گئے تمام پیغمبر ''بھائی'' ہیں۔ حضرت محمدؐ کے پیغمبرانہ پیش روؤں نے آپؐ کو مسترد کرنے کی بجائے اپنے خاندان میں خوش آمدید کہا۔ پیغمبر آپس میں دشمنی نہیں رکھتے یا ایک دوسرے کو اپنا پیروکار بنانے کی کوشش نہیں کرتے؛ اس کی بجائے وہ ایک دوسرے کی بصیرتوں پر توجہ دیتے ہیں۔ انہوں نے نئے پیغمبر کو دعوت دی کہ وہ انہیں تعلیم دیں۔ کہانی کے ایک ورژن میں آنحضرتؐ نے حضرت موسیٰؑ سے پوچھا کہ مسلمانوں کو کتنی کثرت سے عبادت کرنی چاہیے۔ بالاصل خدا نے روزانہ پچاس مرتبہ صلوٰۃ ادا کرنے کا تقاضا کیا تھا، لیکن حضرت موسیٰؑ اس تعداد میں کمی کروانے کے لیے بار بار آنحضرتؐ کو واپس بھیجتے رہے؛ آخر کار خدا نے روزانہ پانچ مرتبہ نماز پڑھنے کا حکم دیا۔ (حضرت موسیٰؑ کے خیال میں یہ تعداد بھی زیادہ تھی۔ [8] مسلم روحانیت کی نقش اولیں اسطورہ میں دیگر روایات کی قدر افزائی موجود ہونے کا امر دکھاتا ہے کہ ابتدائی اسلام میں یہ اجتماعیت کس حد تک مرکزی حیثیت رکھتی تھی۔

اس موڑ کے بعد قرآن اسی مشترکہ تصور پر زور دینے لگا۔ ایک حیرت انگیز اقتباس میں اللہ نے واضح کیا کہ اہلِ ایمان کو ہر پیغمبر کے الہامات پر بلا امتیاز یقین کرنا چاہیے:

> کہہ ہم ایمان لائے اللہ پر اور جو کچھ اترا ہم پر اور جو کچھ اترا ابراہیم پر اور اسمٰعیل اور اسحٰق پر اور یعقوبؑ پر اور اس کی اولاد پر اور جو ملا موسیٰ کو اور عیسیٰ کو اور جو ملا نبیوں کو ان کے پروردگار کی طرف سے۔ ہم جدا نہیں کرتے ان میں کسی کو اور ہم اسی کے فرماں بردار ہیں۔ [9]

کوئی شخص موسیٰ اور عیسیٰ کو احترام دیے بغیر مسلمان نہیں ہو سکتا تھا۔ حقیقی ایمان کسی طے شدہ عقیدے کی بجائے اللہ کی فرمانبرداری اختیار کرنے کا متقاضی تھا۔ درحقیقت صرف ایک روایت سے بالتخصیص وابستگی شرک قرار پا سکتی تھی — ایک بت پرستی جو انسانی دستور کو اللہ کا ہم مقام بنا دیتی ہے۔ یہ قرآن کی ان اولین آیات میں سے ایک ہے جن میں ''اسلام'' اور ''مسلم'' پر زور دیا گیا اور جن کا مادہ اسلمہ ہے: ''خود کو مکمل طور پر کسی اور کی مرضی کے تابع کر دینا۔'' [10] آیت میں آگے

چل کر ارشاد ہوا:

اور جو کوئی چاہے سوا دین اسلام کے اور کوئی دین سو اس سے ہر گز قبول نہیں ہوگا اور وہ آخرت میں خراب ہے۔[11]

یہ آیت عموماً یہ ثبوت پیش کرنے کے لیے بطور حوالہ استعمال کی جاتی ہے کہ قرآن نے اسلام کو واحد اور حقیقی عقیدہ قرار دیا اور صرف مسلمان نجات پائیں گے۔ لیکن تب تک آنحضرتؐ کے مذہب کا نام اسلام قرار نہیں پایا تھا اور جب اس آیت کو اجتماعیت پسندانہ سیاق وسباق میں درست طریقے سے پڑھا جائے تو یہ عین برعکس مفہوم دیتی ہے۔

قرآن میں کہا گیا کہ ایک پیغمبر نے الہام اگلے پیغمبر کے سپرد کیا: پیغام حضرت ابراہیمؑ سے اسمٰعیلؑ سے اسحٰقؑ سے موسیٰؑ کو ملا اور پھر آگے منتقل ہوا۔ قرآن محض سابق صحائف پر مہر "تصدیق" ہے۔[12] اور توریت، انجیل اور قرآن محض خدا کی متواتر خود انکشافی میں مراحل ہیں:

بے شک جو مسلمان ہیں اور جو یہودی ہیں اور فرقہ صابی* اور نصاریٰ جو کوئی ایمان لاوے اللہ پر اور روزِ قیامت پر اور عمل کرے نیک، نہ ان پر ڈر ہے، نہ وہ غمگین ہوں گے۔[13]

کسی بھی شخص کو زبردستی مسلم امّہ میں شامل کرنے کا کوئی تصور موجود نہ تھا۔ ہر ایک الہامی روایت کا اپنا دین، اپنے دساتیر اور بصیرتیں تھیں۔ اللہ نے اپنے پیغمبر کو بتایا: "ہر ایک کو تم میں سے دیا ہم نے ایک دستور اور راہ....."

اور اگر اللہ چاہتا تو تم کو ایک دین پر کر دیتا، لیکن تم کو آزمانا چاہتا ہے، اپنے دیے

* صابئین کو جنوبی عرب (جدید یمن) کا ایک وحدانیت پرست فرقہ خیال کیا جاتا ہے۔ البتہ کچھ مفسرین کو یقین ہے کہ یہاں قرآن کا اشارہ فارسی سلطنت کے زرتشتیوں کی جانب ہے۔

ہوئے حکموں میں۔ سوتم دوڑ کر لو خوبیاں۔ اللہ کے پاس تم سب کو پہنچنا ہے۔
پھر جتاوے گا جس بات میں تم کو اختلاف تھا۔[14]

اللہ کسی ایک روایت کی باتخصیص ملکیت نہیں تھا، بلکہ وہ تمام انسانی علم کا سر چشمہ تھا۔ اللہ نے قرآن کی نہایت باطنیت پسند آیات میں سے ایک میں واضح کیا، ''اللہ روشنی ہے آسمانوں کی اور زمین کی۔'' یہ الوہی نور کسی ایک انفرادی دیے تک محدود نہیں ہو سکتا تھا، بلکہ یہ سب میں مشترک اور سب میں سمایا ہوا تھا۔

مثال اس کی روشنی کی جیسے ایک طاق، اس میں ایک چراغ۔ وہ چراغ دھرا ہو
ایک شیشہ میں۔ وہ شیشہ جیسے ایک تارہ چمکتا ہوا۔ تیل جلتا ہے اس میں برکت
کے درخت کا۔ وہ زیتون ہے، نہ مشرق کی طرف ہے اور نہ مغرب کی طرف
قریب ہے۔ اس کا تیل کہ روشن ہو جائے اگر چہ نہ لگی ہو اس میں آگ۔ روشنی
پر روشنی۔[15]

زیتون کا درخت الہام کے تسلسل کی علامت ہے جو ایک ہی جڑ رکھتا ہے لیکن جس کی شاخیں مختلف مذہبی تجربات میں پھیلی ہوئی ہیں۔ اسے کسی واحد عقیدے یا مقام تک اور مشرق یا مغرب تک محدود نہیں کیا جا سکتا۔

مکہ میں آنحضرتؐ کی حیثیت خطرناک حد تک غیر محفوظ ہو گئی تھی۔ 620ء کے حج کے دوران آپؐ ایک مرتبہ پھر منیٰ میں خیمہ زن زائرین سے ملنے گئے اور امداد و تحفظ حاصل کرنے کی غرض سے ایک کے بعد دوسرے خیمے میں گئے۔ اس مرتبہ مکمل استرداد کی بجائے آپؐ کی ملاقات یثرب سے آئے ہوئے (عقبہ کے کوچے میں خیمہ زن) چھ عربوں کے ایک ٹولے سے ہوئی۔ آپؐ معمول کے مطابق ان کے پاس بیٹھے، اپنے مشن کے متعلق بتایا اور قرآن کی تلاوت کی؛ لیکن اس

مرتبہ آپؐ نے دیکھا کہ زائرین متوجہ اور پُرجوش ہیں۔ جب آپؐ نے بات مکمل کی تو وہ ایک دوسرے سے کہنے لگے کہ یہی وہ پیغمبر ہیں جن کا انتظار ان کے یہودی اور حنیفی پڑوسی کر رہے ہیں۔ اگر حضرت محمدؐ واقعی اللہ کے پیغمبر تھے تو وہی ایسے شخص ہو سکتے تھے جو یثرب کے ناقابلِ حل معلوم ہونے والے مسائل حل کرتے۔

یثرب مکہ جیسا باقاعدہ شہر نہیں بلکہ خیمہ بستیوں کا ایک سلسلہ تھا۔ ہر ایک بستی میں ایک مختلف قبائلی گروہ رہتا تھا جس نے مضبوط حصار بنا رکھے تھے۔[16] یثرب ایک نخلستان میں واقع تھا۔ آتش فشانی چٹانوں اور ناقابل کاشت سنگلاخ زمین میں گھرا ہوا تقریباً 20 مربع میل پر محیط ایک زرخیز جزیرہ۔ کچھ ایک باشندے تجارت سے وابستہ تھے لیکن زیادہ تر کا پیشہ زراعت تھا۔ وہ اپنی کھجوروں، باغات اور قابل کاشت کھیتوں سے ذرائع زندگی حاصل کرتے۔ قریش کے برعکس ان کا دارومدار محض تجارت پر نہیں تھا، اور انہوں نے پرانی بدوی اقدار کو نسبتاً زیادہ سنبھال رکھا تھا۔ بدقسمتی سے ان اقدار میں دیگر قبائلی گروہوں کے ساتھ شدید دشمنی کی روایت بھی شامل تھی۔ علاقہ بالاصل پہل کار یہودی آباد کار زیرِ کاشت لائے، اور چھٹی صدی عیسوی کے یثرب میں تقریباً 20 یہودی قبائل رہتے تھے۔ ان قبائل کے بہت سے ارکان یہودیت اختیار کر لینے والے عرب تھے۔[17] انہوں نے ایک جداگانہ مذہبی شناخت محفوظ رکھی، لیکن دیگر لحاظ سے اپنے بت پرست پڑوسیوں سے قابلِ تمیز نہیں تھے۔ خاندان اور قبیلے سے وفاداری سب چیزوں سے برتر تھی اور کوئی متحدہ ''یہودی امت'' موجود نہ تھی۔ یہودی قبائل نے عرب گروہوں کے ساتھ الگ الگ اتحاد بنائے اور اکثر آپس میں برسرِ پیکار رہتے تھے۔ ان کی کھجوروں کی فصل نے انہیں امیر بنا دیا تھا، لیکن وہ زیورات کے کاریگر، ہتھیار ساز اور دست کار بھی تھے۔ پانچ سب سے بڑے یہودی قبائل — ثعلبہ، hudl، قریظہ، نادر اور قینقاع (مؤخرالذکر یثرب کی واحد منڈی پر مختار) — نے معیشت پر تقریباً مکمل اجارہ قائم کر رکھا تھا۔

لیکن چھٹی صدی عیسوی کے دوران بنی قیلہ کا عرب قبیلہ جنوبی عریبیہ سے ہجرت کر کے نخلستان میں، یہودیوں کے ساتھ آن بسا تھا۔ تب انہوں نے دو الگ الگ قبیلے اوس اور خزرج تشکیل دیے جو انجام کار دو الگ الگ قبیلے بن گئے۔ عربوں نے آہستہ آہستہ اپنی زمین حاصل کی

اپنے قلعے بنائے اور ساتویں صدی عیسوی کے آغاز میں یہودیوں کی نسبت کچھ طاقتور ہو گئے۔ لیکن وسائل کے لیے ناگزیر تگ ودو کے باوجود یہودی اور بت پرست مل جل کر رہنے کے قابل ہوئے۔ یہودی اکثر اپنی کھجوریں لیجانے کے لیے عربوں کو ملازم رکھتے، اور عرب لوگ یہودیوں کی مہارتوں اور ورثے کا احترام کرتے تھے۔ عربوں کے خیال میں یہودی ''اعلیٰ حسب نسب اور جائیداد کے مالک تھے، جبکہ کھجور کے درختوں یا انگورستانوں سے عاری عرب قبیلہ صرف بھیڑوں اور اونٹوں کا مالک تھا۔''(16)

620ء میں حضرت محمدؐ کے ساتھ زائرین کی ملاقات کے وقت صورت حال بگڑ چکی تھی۔ تہہ میں موجود قبائلی رقابت ابھر کر سامنے آئی اور اوس وخزرج اب ایک دوسرے کے ساتھ خونیں لڑائی میں مصروف تھے۔ یہودی قبیلے ان کی کشمکش میں ملوث ہو گئے۔ نضیر اور قریظہ نے اوس کی حمایت کی جبکہ قینقاع خزرج کا حلیف تھا۔ 617ء میں ایک معرکہ ہوا، مگر کوئی بھی فریق فتح نہ پا سکا۔ ہر کوئی تشدد سے تنگ آ چکا تھا۔ مخصوص کلیدی موقعوں پر خزرج کا ایک سردار عبداللہ ابن عبید جنگ و جدل سے الگ تھلگ رہا اور یوں غیر جانبداری کے لیے شہرت حاصل کر لی۔ کچھ نے اسے ایک ممکنہ بادشاہ یا مطلق سردار کے طور پر دیکھا جو کرنے کے قابل تھا۔ لیکن عرب بادشاہت کو پسند نہیں کرتے تھے، اور اس قسم کا تجربہ جزیرہ نما میں کبھی بھی کارگر نہیں ہو سکا تھا۔ اوس فطری طور پر قیادت خزرج کے ایک رکن کے نہ تھے، جبکہ خزرج کے دیگر سردار بھی ابن ابیعہ کے حق میں دست برداری پر آمادہ نہ ہوئے۔

چھ زائرین نے فوراً محسوس کر لیا کہ حضرت محمدؐ اللہ کے ترجمان کی حیثیت میں ابن ابیعہ کی نسبت زیادہ بارسوخ ''حَکَم'' بن سکتے تھے۔ انہیں آپؐ کے مذہبی پیغام پر کوئی اعتراض نہ تھا کیونکہ یثرب کے عرب کچھ عرصہ سے وحدانیت کی جانب مائل ہو رہے تھے۔ اوس وخزرج طویل عرصہ سے خود کو یہودیوں سے کمتر محسوس کرتے آئے تھے کیونکہ ان کے پاس اپنا کوئی صحیفہ نہ تھا اور زائرین یہ جان کر بہت پر جوش ہوئے کہ آخر کار خدا نے عربوں پر ایک پیغمبر معبوث کر دیا تھا۔ انہوں نے بلند توقعات کے ساتھ وہیں خدا کی باقاعدہ اطاعت اختیار کی۔ ''ہم اپنے لوگوں کو چھوڑ آئے ہیں کیونکہ کوئی بھی قبیلہ ان کی طرح پھوٹ اور نفرت کا شکار نہیں۔ شاید خدا آپؐ کے

توسط سے انہیں متحد کر دے۔ آیئے ان کے پاس چلیں اور انہیں آپ کے اس مذہب میں دعوت دیں؛ اور اگر خدا نے انہیں اس مذہب میں متحد کر دیا تو کوئی بھی شخص آپ جیسا طاقتور نہیں ہو گا۔''(19) لیکن انہوں نے تسلیم کیا کہ نخلستان میں ان کا اثر و رسوخ بہت کم ہے اور وہ اپنے سرداروں اور بزرگوں سے مشورہ کرنے کے پابند ہیں۔ آپؐ کے مؤثر ''حکم'' بننے کے لیے لازمی تھا کہ وسیع حمایت حاصل کرتے۔ انہوں نے ایک سال کے اندر اندر حضرت محمدؐ کو رپورٹ پیش کرنے کا وعدہ کیا۔ یہ ایک فیصلہ کن موڑ تھا۔ حالات نے آنحضرتؐ کو مکہ سے پرے دیکھنے اور اپنا قبیلہ چھوڑنے کے غیر معمولی خیال پر بھی غور کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔

آنحضرتؐ نے یثرب میں نئی صورت حال سامنے آنے کے انتظار میں اپنے گھریلو معاملات میں کچھ تبدیلیاں کیں۔ آپؐ کو ایک بیوی کی ضرورت تھی، اور آپؐ کو بنو عامر کے کٹر بت پرست سردار سہیلؓ قریشی کی کزن اور سالی سودہؓ سے شادی کرنے کی تجویز دی گئی۔ حضرت سودہؓ 616ء میں ابائی سینیا جانے والے ایک مسلمان کے نکاح میں رہ چکی تھیں، لیکن اب بیوہ اور ایک موزوں رشتہ تھیں۔ حضرت ابوبکرؓ بھی آنحضرتؐ کے ساتھ ایک قریبی رشتہ استوار کرنے کے خواہشمند تھے اور انہوں نے اپنی چھ سالہ بیٹی حضرت عائشہؓ کا ہاتھ پیش کیا۔ ایک باقاعدہ تقریب میں حضرت عائشہؓ آپؐ کی منگیتر قرار پائیں، اور وہ خود اس موقعہ پر موجود نہ تھیں۔ بعد میں حضرت عائشہؓ نے بیان کیا کہ انہیں اپنی نئی حیثیت کا اولین اشارہ اس وقت ملا جب والدہ نے انہیں گلی میں کھیلنے سے منع کیا اور اس کی بجائے سہیلیوں کو گھر پر بلانے کا کہا۔

مغرب نے حضرت محمدؐ کے حرم کے متعلق کافی گستاخانہ آراء دی ہیں، لیکن عریبیہ میں ـــ جہاں کثیر الازدواجی عام تھی ـــ یہ معمول کا معاملہ تھا۔ آپؐ کی شادیاں رومانوی یا جنسی معاملات نہیں بلکہ عملی مقاصد کے تحت تھیں۔ حضرت سودہؓ غالباً کافی گھریلو قسم کی اور جوانی کے مرحلے سے گزر چکی خاتون تھیں؛ لہٰذا آپ آنحضرتؐ کی خانگی ضروریات بخوبی پوری کر سکتی تھیں۔ آنحضرتؐ نے سہیلؓ کو بھی ساتھ ملانے کی امید کی ہوگی جو ابھی تک الہامات کے متعلق شکوک کا شکار تھے۔ عائشہؓ صدیقہ کے ساتھ آنحضرتؐ کی منگنی ہرگز غیر موزوں نہ تھی۔ اس دور میں تعلقات مضبوط کرنے کے

لیے بالغ مردوں اور حضرت عائشہؓ سے بھی چھوٹی عمر کی بچیوں کے رشتے طے ہوا کرتے تھے۔ یورپ میں یہ رواج جدید عہد تک جاری رہا۔ حضرت عائشہؓ کی بلوغت سے قبل شادی بکار آنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ کسی بھی اور لڑکی کی طرح شادی کے لیے آپؓ کی بلوغت ضروری تھی۔ آنحضرتؐ نے اکثر عملی سیاسی مقاصد کے تحت شادیاں کیں۔ آپؐ ایک بالکل مختلف قسم کا قبیلہ شروع کرنے جا رہے تھے جس کی بنیاد قرابت کی بجائے نظریے پر تھی، لیکن خونی رشتہ اب بھی ایک مقدس قدر تھی اور اس نے تجرباتی امت کو متحد بنانے میں مدد دی۔

621ء کے حج کے دوران یثرب کے چھ نو مبائعین وعدے کے مطابق مکہ آئے اور اپنے ساتھ مزید سات کو بھی لائے۔ اب پھر حضرت محمدؐ سے ان کی ملاقات عقبہ کی گلی میں ہوئی اور انہوں نے صرف اور صرف اللہ کی پرستش کرنے، چوری، جھوٹ، دختر کشی سے باز رہنے اور سماجی انصاف سے متعلق آنحضرتؐ کی ہدایت پر عمل کرنے کا عہد کیا۔ یہ عہد بیعت عقبہ کے نام سے مشہور ہے۔ بدلے میں حضرت محمدؐ نے ان سے جنت کا وعدہ فرمایا۔[20] اس پہلی بیعت میں مذہب اور اخلاقیات پر زور دیا گیا اور ابھی تک کوئی سیاسی عہد نہیں ہوا تھا۔ جب زائرین واپس یثرب گئے تو ایک قابل بھروسہ مسلمان مصعبؓ بن عمیر کو بھی ساتھ لے گئے تا کہ وہ اہلِ یثرب کو نئے عقیدے کی تعلیم دے سکیں۔

یہ ایک دانش مندانہ اقدام تھا۔ نخلستان میں قبائلی منافرت اس قدر شدید تھی کہ اوس اور نہ ہی خزرج اپنے مخالف کو نماز پڑھتے یا قرآن کی تلاوت کرتے دیکھنا برداشت کر سکتے تھے۔ چنانچہ ضروری تھا کہ یہ فرائض باہر کا کوئی غیر جانبدار شخص انجام دے۔ شروع میں اوس نئے عقیدے کے دشمن تھے، لیکن آہستہ آہستہ قرآن کی طاقت نے ان کے تحفظات دور کر دیے۔ ایک روز اوس قبیلہ کا ایک سردار سعد بن معاذ یہ سن کر بہت دہشت زدہ ہوا کہ مصعب اس کے علاقے میں تبلیغ کر رہا تھا۔ چنانچہ اس نے اسے باہر نکالنے کے لیے اپنے نائب کو بھیجا۔ نائب اپنا نیزہ لہراتے ہوئے چھوٹے سے ٹولے پر آن دھمکا اور مصعب سے پوچھا کہ اسے کمزور و نادان لوگوں میں جھوٹی باتوں کا پرچار کرنے کی ہمت کیسے ہوئی۔ لیکن مصعب نے جاہلی غصب ناکی کے ساتھ ردِ عمل دینے کی بجائے اس سے کہا کہ تشریف رکھے اور خود دیکھ لے۔ نائب مان گیا، اپنا نیزہ زمین میں گاڑا اور

قرآن سنتے سنتے ہی اس کے تیور بدلنے لگے۔ وہ پکارا، "کیسا زبردست اور خوبصورت وعظ ہے! اس مذہب میں داخل ہونے کے لیے کیا کرنا پڑتا ہے؟" اللہ پر ایمان لانے اور سربسجود ہونے کے بعد وہ اپنے سردار کو خبر دینے واپس گیا۔ سعد بہت غصے میں آیا، اپنا نیزہ سنبھالا اور مصعب سے دو دو ہاتھ کرنے خود روانہ ہوا، لیکن قران نے اس پر بھی ہیبت طاری کر دی۔ تب اس نے اپنے لوگوں کو بلایا اور اپنی پیروی کرنے کو کہا۔ سارا قبیلہ بہ صورت جماعت اسلام میں داخل ہو گیا۔[21] سعد کے ڈرامائی قبولِ اسلام کی خبر نے دیگر سرداروں پر بھی زبردست اثر ڈالا جو مصعب کو زیادہ سنجیدگی سے لینے لگے۔

کچھ ہی عرصہ بعد نخلستان کے تقریباً ہر گھرانے میں مسلمان موجود تھے۔ مکہ میں آنحضرتؐ کا تبلیغی مشن کافی حد تک اس وجہ سے جمود کا شکار رہا کیونکہ قریش کو یقین نہیں آ سکتا تھا کہ آپؐ جیسا کوئی عام شخص بھی خدا کا پیغمبر ہو سکتا ہے، لیکن یثرب میں حالات مختلف تھے۔[22] آنحضرتؐ کوئی معمولی آدمی نہیں تھے کہ جو بازار میں گھومتے پھرتے یا دوسروں کی طرح کھاتے پیتے نظر آتے، بلکہ آپؐ ایک کم آمیز، پراسرار ہستی تھے جن کی آمد کا بڑے شوق سے انتظار کیا جا رہا تھا۔ مکہ میں آنحضرتؐ کی تبلیغ حرم کے مسلک کے لیے خطرہ بنی جو معیشت میں اہمیت کی حامل تھی، لیکن یثرب میں کوئی بھی عبادت گاہ بتوں سے بھری ہوئی نہیں تھی۔ تاہم، ہر شخص نے نئے مذہب کو گلے سے نہ لگایا۔ فطری طور پر ابن ابیعہ کو خوف تھا کہ اس کی حیثیت کھوکھلی ہوتی جا رہی تھی؛ دیگر ابھی تک پرانی بت پرستی یا حنیفیہ کے پیروکار تھے، لیکن اس مرحلے پر مخالفت دب گئی۔ اگر نئے پیغمبر واقعی یثرب کے مسائل حل کر سکتے تھے تو ان سے کچھ مادی فائدہ لینا چاہیے تھا۔ یہودی قبائل آنحضرتؐ کو شبہ کا فائدہ بھی دینے کو تیار تھے، بالخصوص اس لیے کیونکہ مسلمان ان کے پیغمبروں کو احترام دیتے تھے اور ان کی کچھ رسوم بھی اختیار کر چکے تھے۔

آنحضرتؐ نے حال ہی میں کچھ نئے دستور متعارف کروائے تھے۔ شبینہ سفر (اسراء) کے نتیجے میں ہی غالباً مسلمان اب یروشلم کی طرف منہ کر کے (قبلہ) عبادت کرنے لگے جو اہل الکتاب کا مقدس شہر تھا۔ آنحضرتؐ نے مصعب کو جمعہ کے روز ایک خصوصی عبادت منعقد کرنے کی بھی ہدایت دی تھی جب یہودی اپنے سبت کی تیاری کر رہے ہوتے، اور پھر وہ "یوم کپر" کے دن

ان کے ساتھ روزہ رکھتے۔ مسلمان اب دن کے وسط میں، یہودیوں کی طرح، عبادت کرتے اور انہوں نے غذا کے یہودی قواعد میں ہی تھوڑی بہت ترمیم کرلی، جیسا کہ ابتدائی عیسائیوں نے بھی کیا تھا۔ محققین اس خیال پر مائل رہے کہ حضرت محمدؐ نے یثرب کے یہودیوں کو ساتھ ملانے کی خاطر ان نئی عقیدتوں کو متعارف کروایا، لیکن حال ہی میں اس نکتۂ نظر کو چیلنج کیا گیا ہے۔ حضرت محمدؐ نے یہودیوں سے یہ توقع نہیں کی ہوگی کہ وہ آپؐ کے مذہب کے پیروکار بن جائیں گے، کیونکہ ان کے پاس اپنا الہامی دین موجود تھا۔ خدا نے ارشاد فرمایا تھا کہ ہر امت کا اپنا نبی ہوگا۔[24] لیکن مسلمانوں کے لیے خاندانِ ابراہیمؑ کے دیگر اراکین کی ہی طرح عبادت کرنا اور روزے رکھنا فطری بات تھی۔

622ء میں زائرین کا ایک بڑا قافلہ حج کے لیے یثرب سے روانہ ہوا۔ کچھ بت پرست، لیکن 73 مرد اور دو عورتیں مسلمان بھی تھیں۔ آنحضرتؐ ایک مرتبہ پھر ان سے ملنے عقبہ گئے، لیکن اس مرتبہ ملاقات رات کے سناٹے میں ہوئی۔ اس موقعہ پر مخالفین کی سخت کارروائی کا ڈر تھا اور تمام روابط منقطع ہو چکے تھے۔ قرآن میں قریش کی ''سازشوں'' کا ذکر ہے: شاید آنحضرتؐ کے پاس یہ یقین کرنے کی وجہ موجود تھی کہ کافر آپؐ کو شہر سے نکالنے اور مسلمانوں کو حرم میں داخلے سے روکنے کی منصوبہ بندی کر رہے تھے۔[25] اب آپؐ اپنا قبیلہ چھوڑنے کے لیے عملی اقدامات کر رہے تھے۔ ابن اسحٰق کا کہنا ہے کہ یہ آپ کا دانش مندانہ فیصلہ تھا، لیکن قرآن میں بار بار کہا گیا کہ مسلمانوں کو مکہ سے ''نکالا گیا۔''[26] ملاقات نہایت خفیہ انداز میں ہوئی۔ یثرب سے آئے ہوئے مسلمانوں نے اپنے قافلے میں شامل بت پرستوں سے بھی اس کا ذکر نہ کیا، مبادا وہ کہیں بات کر دیں اور قریش ہوشیار ہو جائیں۔

حضرت محمدؐ ایک قطعی فقید المثال قدم اٹھانے والے تھے۔[27] آپؐ مکہ کے مسلمانوں سے یثرب کی طرف ہجرت کا کہہ رہے تھے۔ اس کا مطلب محض جائے اقامت کی تبدیلی نہیں تھا۔ مسلمان اپنے رشتہ داروں کو چھوڑنے اور غیروں کی مستقل سرپرستی قبول کرنے جا رہے تھے۔ عرب میں — جہاں قبیلہ مقدس ترین قدر تھا — یہ بات گستاخی کے مترادف تھی۔ یہ دیویوں کے خلاف

قرآنی آیات کے مقابلہ میں کہیں زیادہ دھچکا پہنچانے والی بات تھی۔ کنفیڈریشن کا ایک نظام ہمیشہ سے موجود تھا جس کے تحت کوئی فرد یا پورا گروپ کسی اور قبیلے کے اعزازی رکن بن سکتے تھے، لیکن یہ انتظامات عموماً عارضی ہوتے اور ان کے نتیجے میں اپنے لوگوں سے تعلق منقطع نہیں ہو جاتا تھا۔ لفظ ''ہجرت'' ایک نہایت تکلیف دہ انقطاع کا مفہوم رکھتا ہے۔ اس کے مادہ ''ھـجـر'' کا ترجمہ یوں کیا گیا: ''وہ دوستانہ یا پُر محبت تعلقات یا میل جول سے کٹ گیا......وہ ان کے ساتھ...... منسلک نہ رہا۔'' تب کے بعد، ہجرت کر کے یثرب چلے جانے والے مسلمان مہاجرین کہلائے: یہ صدماتی بے وطنی ان کی نئی شناخت کا محور تھی۔

یثرب کے مسلمان ایک خطرناک تجربہ بھی شروع کر رہے تھے۔ اگر کسی غیر کو کوئی قبیلہ قبول بھی کر لیتا تو وہ ہمیشہ ایک ''ظـالـم'' رہتا: یعنی ''کمتر، فرومایہ اور برا۔''(28) شعراء نے ظالم کو ایک حقیر، فالتو چیز کے طور پر بیان کیا۔ قبائلی وفاداری کو قرابت داروں کے لیے پُر جوش محبت اور غیر کے لیے سخت تحقیر کے طور پر تجربہ کیا گیا۔ جو بھی شخص کسی قابل تحقیر ظـالـم کو اپنے لوگوں پر فوقیت دیتا، وہ زبردست نفرت اور تنقید کا نشانہ بن جاتا۔ لیکن اب اوس اور خزرج قریشی حضرت محمدؐ کے ساتھ معاہدۂ یگانگت کرنے اور غیروں کے ایک بڑے گروہ کو تحفظ و امداد (نصر) دینے کا وعدہ کرنے جا رہے تھے جو ناگزیر طور پر نخلستان کے محدود وسائل پر بوجھ بنتے۔ تب کے بعد یثرب کے مسلمان ''انصار'' کہلائے جس کا ترجمہ عموماً مددگار کیا جاتا ہے، لیکن یہ متعلقہ معاملات کا کچھ کمزور تاثر دیتا ہے۔ نصر کا مطلب تھا کہ آپ قوت کے ساتھ مدد کے لیے ہر دم تیار رہیں گے۔ اس رات عقبہ میں آنحضرتؐ سے ملاقات ہونے پر انصار نے بیعت ثانی کا فیصلہ کیا۔

وقت آنے پر انصار اپنے بت پرست ساتھیوں کو خیموں میں سوتا چھوڑ کر چپکے سے عقبہ پہنچے جہاں ان کی ملاقات آنحضرتؐ اور آپؐ کے چچا حضرت عباسؓ سے ہوئی جو آپؐ کے ترجمان کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ حضرت عباسؓ نے تب تک اسلام قبول نہیں کیا تھا اور آنحضرتؐ کے مکہ چھوڑنے کے فیصلے نے انہیں ضرور ششدر کیا ہوگا، لیکن وہ یثرب میں آپؐ کی حفاظت و سلامتی یقینی بنانا چاہتے تھے۔ انہوں نے کہا کہ حضرت محمدؐ مکہ میں بنو ہاشم کی حفاظت میں تھے، لیکن انصار کے ساتھ شامل ہونے کی خاطر اس حفاظت سے دست برداری پر تیار ہوئے۔ اگر انہیں آپؐ کی

حفاظت کے حوالے سے کوئی خفیف ترین شبہ ہے تو سارا منصوبہ وہیں ختم کر دیں۔ لیکن انصار نے مصمم ارادہ ظاہر کیا۔ خزرج کے سردار براء ابن مرعور نے آنحضرتؐ کا ہاتھ تھاما اور قسم کھائی کہ اوس وخزرج آپؐ کو اسی طرح تحفظ دیں گے جیسے اپنے اہلِ خانہ کو دیتے ہیں۔ ابھی وہ یہ کہہ ہی رہا تھا کہ انصار میں سے ایک شخص بول اٹھا: اس صورت میں کیا ہوگا اگر حضرت محمدؐ واپس مکہ چلے گئے اور قریش کے ڈر سے یثرب کو چھوڑ دیا؟ آنحضرتؐ نے جواب دیا: ''میں تم سے ہوں اور تم مجھ سے ہو۔ جو تمہارے خلاف جنگ کرے گا میں بھی اس سے لڑوں گا اور جس کے ساتھ تم امن کرو گے میں بھی اس کے ساتھ امن کروں گا''۔[30] چنانچہ انصار نے یہ حلف دیا: ''ہم وعدہ کرتے ہیں کہ پیغمبر کی مکمل متابعت میں جنگ کریں گے، چاہے حالات کیسے ہی ہوں؛ کہ ہم کسی سے زیادتی نہیں کریں گے؛ کہ ہم تمام موقعوں پر سچ بولیں گے؛ اور یہ کہ ہم خدا کی خدمت میں کسی رکاوٹ سے نہیں ڈریں گے۔''[31]

یہ معاہدہ قبائلی اصطلاحات میں اور باہمی حفاظت پر مرکوز تھا۔[32] ابھی تک واحد، متحدہ امت کا کوئی خیال پیدا نہیں ہوا تھا۔ اوس، خزرج اور قریش ابھی تک جداگانہ طور پر کام کر رہے تھے۔ آنحضرتؐ کسی ریاست کے سربراہ نہیں بلکہ اوس وخزرج کے درمیان ثالث اور مہاجرین کے سردار کی حیثیت میں یثرب گئے تھے۔ انصار مختلف قبیلچوں سے تعلق رکھنے والے بارہ ''نگرانوں'' کے ماتحت تھے۔ اگرچہ یثرب میں اسلام نے ترقی کی جانب بڑے بڑے قدم اٹھائے — صرف ایک سال بعد مسلم برادری مکہ کی غیر متحد امت جتنی ہوگئی — لیکن یہ امر بدستور قائم رہا کہ ہجرت کے بعد بھی مسلمان نخلستان میں ایک چھوٹی سی اقلیت ہی تھے۔ ان کے مقابلے میں بت پرستوں، حنیفوں اور یہودیوں کی تعداد کہیں زیادہ تھی۔[33] بیعت عقبہ ثانی نے اسلام کی اشاعت کا نیا سلسلہ شروع کیا: نیا مذہب دیگر قبائلی گروہوں تک سرایت کر گیا تھا، لیکن یہ ابھی تک قبائلی دساتیر سے بالاتر نہیں ہو سکا تھا۔ ہجرت ایک خطرات سے پُر مہم جوئی تھی، ایک ناقابلِ تنسیخ اور خوفناک قدم۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ یہ مہم کیسے کامیاب ہوگی کیونکہ اس سے پہلے عرب میں ایسا کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔

حج کے بعد انصار واپس یثرب گئے اور مسمان مہاجرین کی آمد کا انتظار کرنے لگے۔ اب قرآن نے یثرب کی بستی کو یہودیوں کا دیا ہوا آرامی نام ''مدینہ'' (شہر) اپنایا۔ یثرب اب المدینہ

(پیغمبر کا شہر) بننے کو تھا۔ مکہ میں حضرت محمدؐ نے مسلمانوں کو ہجرت پر مائل کرنا شروع کیا، لیکن آپؐ حکم چلانے کی پوزیشن میں نہ تھے۔ اس مہم کے لیے خود میں ہمت نہ محسوس کرنے والا شخص وہیں رہنے پر مختار تھا۔ لیکن 622ء کے ماہ جولائی و اگست میں تقریباً 70 مسلمان اپنے گھر والوں کو ساتھ لے کر مدینہ کی طرف روانہ ہوئے۔ وہاں انہوں نے انصار کے گھروں میں قیام کیا، تا آنکہ ان کے اپنے گھر نہ تعمیر ہو جائیں۔ لگتا ہے کہ قریش نے ان کی راہ میں رکاوٹ ڈالنے کی کوئی منظم کوشش نہ کی، البتہ کچھ عورتوں اور بچوں کو جانے سے روک دیا گیا اور ایک مرد کو اس کے اونٹ کے پیچھے باندھ کر گھسیٹتے ہوئے واپس لائے۔ مسلمان نہیں چاہتے تھے کہ سب کی توجہ ان کی ہجرت کی جانب مرکوز ہو۔ انہوں نے شہر کی حدود سے باہر ملنے اور چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں سفر کرنے کا فیصلہ کیا۔ حضرت عمرؓ اپنے اہلِ خانہ کے ہمراہ روانہ ہوئے؛ حضرت عثمانؓ بن عفان اور حضرت رقیہؓ نے زیدؓ اور حمزہؓ کے ہمراہ سفر کیا۔ لیکن حضرت محمدؐ اور حضرت ابوبکرؓ تقریباً سب کے روانہ ہو جانے تک مکہ میں ہی رہے۔ کچھ ہی دیر گزری تھی کہ اس وسیع پیمانے پر ہجرت نے شہر میں پریشان کن رخنے پیدا کر دیے۔ بنو ہاشم کے گھاؤ صاف دکھائی دینے لگے۔ مکہ کے وسط میں بڑے بڑے گھر ویران لگتے تھے جن کے دروازے ہوا کے باعث آگے پیچھے جھولتے رہتے۔'' (34)

ماہ اگست میں، روانگی سے کچھ عرصہ پہلے مکہ میں آپؐ کا تحفظ دہندہ معطم فوت ہو گیا۔ اب شہر میں آپؐ کی حیثیت غیر یقینی ہو گئی کیونکہ مخالفین آپؐ کے قتل (نعوذ باللہ) کی منصوبہ بندی کر رہے تھے۔ آپؐ کو انجام تک پہنچانے کے لیے ایک خصوصی اجلاس بلایا گیا جس میں ابولہب کی غیر حاضری معنی خیز تھی۔ کچھ بزرگوں نے مشورہ دیا کہ آپؐ کو شہر بدر کر دیا جائے، لیکن دیگر نے نکتہ اٹھایا کہ آپؐ کو یثرب کے غیر منظم لوگوں کے ساتھ جا ملنے کی اجازت دینا خطرے سے خالی نہیں ابوجہل نے منصوبہ پیش کیا: ہر قبیلہ ایک ایک طاقتور اور مضبوط پشت پناہی کا مالک نوجوان منتخب کرے۔ وہ سب مجموعی طور پر سارے قبیلے کے نمائندے ہوں گے اور حضرت محمدؐ پر قاتلانہ وار کریں گے۔ کوئی قصاص کا مطالبہ نہیں کر سکے گا کیونکہ بنو ہاشم سارے قریش سے دشمنی نہیں لے سکتے تھے۔

چنانچہ اس رات بہ احتیاط منتخب کردہ نوجوانوں کا ٹولہ حضرت محمدؐ کے گھر کے باہر جمع ہوا، لیکن وہ

حضرت سودہؓ اور آپؐ کی کچھ بیٹیوں کی آوازیں سن کر بہت پریشان ہوئے۔ کسی مرد کو اس کی عورتوں کے سامنے مارنا شرم ناک تھا، لہٰذا انہوں نے صبح تک انتظار کرنے کا فیصلہ کیا جب آپؐ گھر سے باہر آتے۔ ان میں سے ایک شخص نے کھڑکی سے اندر جھانکا اور آپؐ کے بستر پر آپؐ ہی کی چادر لپیٹ کر کسی کو لیٹے دیکھا۔ حضرت محمدؐ حملہ آوروں کی آنکھوں میں دھول جھونک کر روانہ ہو چکے تھے۔ آپؐ اپنے پیچھے حضرت علیؓ کو اپنی چادر اوڑھ کر بستر پہ لیٹنے کو کہہ گئے تھے۔ اگلی صبح جب حضرت علیؓ گھر سے باہر آئے تو نوجوانوں کو اپنے ساتھ ہونے والی دغابازی کا احساس ہوا۔ قریش نے حضرت محمدؐ کو زندہ یا مردہ واپس لانے والے کے لیے 100 اونٹنیاں انعام کا اعلان کیا۔

تب تک حضرت محمدؐ اور حضرت ابوبکرؓ شہر سے باہر ایک پہاڑی غار میں پناہ لے چکے تھے۔ دونوں حضرات تین دن تک وہیں ٹھہرے، اور آپ دونوں کے مددگار گاہے بگاہے خبریں اور اشیائے ضروریہ لے کر آتے رہے۔ بتایا جاتا ہے کہ ایک کھوجی پارٹی غار کے دہانے تک آ پہنچی لیکن اندر داخل ہونے کی ضرورت محسوس نہ کی کیونکہ ایک مکڑی نے مدخل پر جالا بُن رکھا تھا، اور ایک پہاڑی فاختہ عین اس جگہ پر گھونسلہ بنا کر انڈوں پر بیٹھی ہوئی تھی جہاں پاؤں رکھ کر غار میں داخل ہوتے تھے۔ اس تمام عرصے کے دوران حضرت محمدؐ نہایت پرسکون اور خدا کی موجودگی کے احساس سے مغلوب رہے۔ قرآن میں بتایا گیا ہے کہ آپؐ نے کس طرح حضرت ابوبکرؓ کی ڈھارس بندھائی: ''غم نہ کرو۔ خدا بالکل ہمارے ساتھ ہے۔ تب خدا نے آپ کے دل کو سکون سے بھر دیا۔''[35] قرآن اصرار کرتا ہے کہ جب مسلمان نے خود کو خوفناک یا پریشان کن حالات میں پائیں تو ہوش اور تحمل سے کام لیں، اور جاہلیہ والے غیض و غضب کا نشانہ نہ بنیں۔

شور و غوغا کم ہونے پر حضرت محمدؐ اور حضرت ابوبکرؓ غار ثور سے باہر آئے، پہاڑی فاختہ کو پریشان کرنے سے گریز کیا اور ان دو اونٹنیوں پہ سوار ہوئے جو حضرت ابوبکرؓ نے سفر کے لیے تیار کی تھیں۔ حضرت ابوبکرؓ بہتر اونٹنی آنحضرتؐ کو دینا چاہتے تھے، لیکن آپؐ نے اس کی قیمت ادا کرنے پر اصرار کیا۔ یہ آپؐ کی ذاتی ہجرت، اللہ کے حضور قربانی تھی اور اس ساری مہم کی ذمہ داری اپنے کاندھوں پہ لینا ضروری تھا۔ آپؐ نے اس اونٹنی کو قصویٰ کا نام دیا اور وہ تاحیات آپؐ کی پسندیدہ ترین سواری رہی۔ یہ ایک خطرناک سفر تھا کیونکہ راستے میں آپؐ کو کسی کا بھی تحفظ حاصل نہ تھا۔

چنانچہ راہنما آپؐ کو اوپر سے گھما کر لے گیا اور ممکنہ تعاقب کرنے والوں کو چکر دینے کی خاطر آڑا ترچھا راستہ اپنایا۔

دریں اثنا مدینہ میں مسلمان شدت سے آپؐ کے منتظر تھے۔ مکہ سے آئے ہوئے متعدد مہاجرین نخلستان کے انتہائی جنوبی گوشے قبعہ (Quba') میں مقیم تھے اور روزانہ عبادت کے بعد آتش فشانی چٹانوں پہ چڑھ کر ویران گردو پیش پر نظر ڈالا کرتے تھے۔ 4 ستمبر 622ء کی صبح کو ایک یہودی نے افق پر گرد کا ایک غبار دیکھا اور انصار کو بلایا: ''اے بنی قیلہ! وہ آ گئے! وہ آ گئے!'' فوراً مرد، عورتیں اور بچے مسافروں کا استقبال کرنے کے لیے آگے بڑھے اور انہیں ایک کھجور کے درخت تلے آرام کرتے ہوئے پایا۔

حضرت محمدؐ اور حضرت ابوبکرؓ تین دن تک قبعہ میں رہے، لیکن شہر (نخلستان کا سب سے گنجان آباد علاقہ) میں موجود مسلمان آپؐ کو دیکھنے کے لیے بے قرار تھے۔ چنانچہ وہ آپؐ سے ملنے اور یہ فیصلہ کرنے کے لیے آگے بڑھے کہ آپؐ کہاں قیام کریں گے۔ راستے میں بہت سے لوگوں نے آپؐ سے اپنے ہاں قیام کرنے کی درخواست کی، لیکن آپؐ نے خوش اخلاقی کے ساتھ انکار کر دیا کیونکہ آپؐ مدینہ کے اندر متحارب گروہوں سے خود مختار رہنا چاہتے تھے۔ اس کی بجائے آپؐ نے فرمایا کہ جہاں قصویٰ ٹھہرے گی آپؐ وہیں قیام کریں گے۔ آخر کار وہ ایک ''مِربد'' (خشک کھجوریں رکھنے کی جگہ) کے سامنے رکی جس کا مالک انصار میں سے ایک تھا۔ حضرت محمدؐ اونٹنی سے اترے، اپنا سامان قریب ترین گھر میں رکھوایا اور پھر مالک سے اس زمین کی خریداری کے لیے گفت وشنید کرنے لگے۔ سودا طے پا جانے پر تمام مسلمان آپؐ کے لیے مکان تعمیر کرنے کے کام میں لگ گئے جو جائے عبادت کا کام بھی دینے لگا۔ مہاجرین کے لیے یہ کام بہت مشکل تھا کیونکہ قریش جسمانی مشقت کے عادی نہ تھے، اور طرحدار حضرت عثمانؓ نے بالخصوص اس کام کو جانکاہ پایا۔

پہلی مسلم عمارت پرشکوہ نہیں تھی لیکن یہ مستقبل کی تمام مساجد کے لیے مثالی نمونہ بن گئی۔ یہ بنیادی طور پر ایک **مسجد** (جائے سجدہ)، ایک کشادہ احاطہ تھی جہاں ساری امت مل کر صلوٰۃ ادا کر سکے۔ یہ ابتدائی اسلامی سادگی کی غماز بھی تھی۔ چھت کو درخت کے تین تنوں سے سہارا دیا گیا

تھا، اور کوئی نمایاں منبر موجود نہ تھا؛ حضرت محمدؐ جماعت سے خطاب کرنے کے لیے ایک چھوٹی سی چوکی پہ کھڑے ہوتے۔ حضرت محمدؐ اور آپ کی زوجین مسجد کے سامنے والے احاطہ کے گرد بنے حجروں میں رہتی تھیں۔ یہ عوامی اور سیاسی اجلاس گھر تھا؛ مدینہ کے غریبوں کو بھی خیرات اور مدد حاصل کرنے کی خاطر وہاں آنے کی دعوت دی جاتی۔

مدینہ میں اس نہایت منکسر عمارت نے توحید کا آئیڈیل پیش کیا۔[36] آنحضرتؐ دکھانا چاہتے تھے کہ جنسی، الوہی اور گھریلو پہلو یکجا ہو سکتے تھے، اور یقیناً انہیں یکجا ہونا ہی چاہیے تھا۔ اسی طرح سیاست، سماجی بہبود اور سماجی نظم کو بھی الوہی حلقے میں لایا گیا۔ آنحضرتؐ نے اپنی زوجین کو مسجد سے چند قدم کے فاصلے پر مقیم کر کے واضح اعلان کیا تھا کہ عوامی اور سماجی زندگی میں کوئی امتیاز نہیں ہونا چاہیے اور نہ ہی کوئی صنفی امتیاز برتنا چاہیے۔ اسلام میں تقدس اخراجی کی بجائے اشتمالی تھا۔ اگر یہودی اور عیسائی چاہتے تو عبادت کے لیے مسجد میں آ سکتے تھے، کیونکہ وہ بھی خدا کے خاندان کا حصہ تھے۔

عمارت ہجرت سے کوئی سات ماہ بعد اپریل 623ء میں مکمل ہوئی۔ شمالی دیوار پر ایک پتھر قبلہ اول یعنی یروشلم کی سمت کا تعین کرتا تھا۔ شروع میں صلوٰۃ کے لیے باقاعدہ بلایا نہیں جاتا تھا، لیکن یہ یقیناً غیر تسلی بخش طریقہ تھا، کیونکہ ہر کوئی مختلف اوقات پر آتا۔ پہلے یہودیوں کی طرح مینڈھے کا سینگ یا مقامی عیسائیوں کی طرح لکڑی کی کھڑتالیں (clapper) استعمال کرنے کا سوچا گیا، لیکن انصار میں سے ایک شخص نے ایک اہم خواب دیکھا۔ سبز عبا میں ملبوس ایک آدمی نے اس سے کہا تھا کہ بلند اور گونج دار آواز والا کوئی شخص عبادت شروع ہونے کا اعلان کرنے کے لیے ''اللہ اکبر'' پکارا کرے — مسلمانوں کی اولین ترجیح کی یاد دہانی۔ آنحضرتؐ کو یہ خیال پسند آیا اور بلند آواز والے سابق ابائی سینیائی غلام بلالؓ کو منتخب فرمایا۔ وہ ہر صبح مسجد کے قریب کسی بلند ترین مکان پہ چڑھ کر سورج نکلنے کا انتظار کرتے اور پھر ''اللہ اکبر'' کی صدا لگا کر اذنِ عبادت دیتے — ''اے خدا! میں تیری مدح کرتا اور قریش کے لیے تیری مدد مانگتا ہوں کہ وہ تیرا مذہب قبول کر لیں۔''[37] مسلمانوں نے اپنا قبلہ بدل کر یروشلم بنا لیا تھا، لیکن مکہ کو نہ بھولے۔ جب حضرت محمدؐ کو معلوم ہوا کہ بہت سے مہاجرین وطن کی یاد میں مبتلا ہیں تو دعا فرمائی: ''اے اللہ، ہمیں اس شہر سے بھی اتنی محبت

کرنا سکھا جتنی ہم مکہ سے کرتے ہیں، بلکہ اس سے بھی زیادہ۔"[38]

ہجرت کی عظیم غریب الوطنی کا مطلب تھا کہ اب بھی پرانی قبائلی اصطلاحات استعمال کرنے کے باوجود مسلمانوں کو ایک بالکل مختلف قسم کی امت تخلیق کرنا تھی۔ حضرت محمدؐ کے اولین اقدامات میں سے ایک ''بھائی چارے'' کا نظام قائم کرنا تھا جس کے تحت ایک مہاجر اور ایک انصار کو بھائی بنایا گیا تا کہ مسلمان قرابت داری کے اصولوں سے بالاتر ہو کر متحد ہو جائیں۔ مہاجرین و انصار کی سیاسی علیحدگی جلد ہی ختم ہو گئی: جب بارہ انصاری ''نگہبانوں'' میں سے ایک فوت ہوا تو حضرت محمدؐ نے اس کی جگہ لے لی۔[39] مسلمان آہستہ آہستہ ایک نیا قبیلہ تخلیق کر رہے تھے جس نے پرانے قرابت داری کے تعلقات کی نئی تعبیر کی۔ ہجرت کرنے والے خود کو پیچھے مکہ میں رہ جانے والے مسلمانوں سے فرق سمجھتے تھے، حالانکہ ان کا تعلق ایک ہی خونی گروہ سے تھا۔ مسلمانوں کا تعلق چاہے کسی بھی قبیلے یا قبیلچے سے ہوتا لیکن وہ آپس میں کشت و خون نہیں کر سکتے تھے۔ مہاجرین و انصار کا کسی بھی روایتی قبیلے کی طرح ٹھوس انداز میں منظم ہونا لازمی تھا۔[40] قبیلے کی طرح امت واحد برادری تھی اور اس نے معمول کے انداز میں غیر مسلموں میں بھی اتحادی بنائے۔[41]

آنحضرتؐ اب امت کے قائد کی حیثیت میں اپنی اخلاقی اور سماجی اصلاحات ایسے انداز میں لاگو کر سکتے تھے جو مکہ میں اختیار کرنا ناممکن تھا۔ آپؐ کا مقصد ایک حلیم معاشرہ تخلیق کرنا تھا۔ ''مومنین'' محض اہل ایمان نہ تھے۔ ان کا عقیدہ عملی طور پر عیاں ہونا ضروری تھا: انہیں نماز پڑھنا، دوسروں کو اپنی دولت میں شریک کرنا اور امت سے متعلقہ امور میں باہمی صلاح و مشورہ کرنا تھا تا کہ امت کا اتحاد قائم رکھا جا سکے۔ حملہ ہونے کی صورت میں وہ اپنا دفاع کر سکتے تھے، لیکن پرانے جاہلی انداز میں غضبناک ہو جانے کی بجائے انہیں ہمیشہ عفو و درگزر پر تیار رہنا چاہیے تھا۔ خود بخود، انتقامی جواب — مروۃ کے مطابق ایک فریضہ — ایک عظیم برائی بن سکتا تھا۔ قرآن نے بار بار زور دیا کہ جو کوئی بھی اپنے دشمن کو معاف کر دے اور امن قائم کرے، اسے اللہ سے اجر ملے گا؛ اور اگر کوئی شخص خراب حالات میں صبر کرے اور عفو و درگزر سے کام لے تو یہ یقیناً بہتر ہے۔[42]

لیکن یہ بدلاؤ راتوں رات نہیں ہو گیا کیونکہ مسلمانوں کے دل میں جاہلیہ کا پرانا جذبہ ابھی تک چھپا بیٹھا تھا۔ ہجرت سے کچھ ہی عرصہ بعد ایک بت پرست عرب نے مسلمانوں کا ایک گروہ دیکھا

—جس میں اوس وخزرج دونوں کے ارکان شامل تھے— جو آپس میں یوں باتیں کر رہے تھے جیسے ان کے قبیلوں میں کبھی دشمنی ہی نہ رہی ہو۔ وہ شخص بہت غصے میں آیا۔ واضح طور پر اسلام انہیں نرم خو اور کمزور بنا رہا تھا! اس نے ایک نوجوان یہودی کو حکم دیا کہ ان لوگوں کے پاس بیٹھ کر نظمیں گائے جن میں پرانے سنگین تنازعات کی یاد دہانی کروائی گئی تھی۔ جلد ہی پرانی، دبی ہوئی شاؤنیت کی چنگاری بھڑک اٹھی اور مسلمان ایک دوسرے کو مارنے کے لیے لپکے۔ حضرت محمدؐ فوراً جائے تنازع پر پہنچے اور فرمایا، ''کیا تم اب بھی جاہلیہ کے پیروکار ہو جبکہ میں تمہارے درمیان موجود ہوں اور جبکہ خدا نے تمہاری راہنمائی فرمائی ہے، تمہیں عزت دی ہے اور تمہارے پرانے جاہلی بندھنوں کو توڑ کر تمہیں کفر سے نجات دلائی ہے اور تمہیں ایک دوسرے کا دوست بنا دیا ہے؟'' انصار بہت شرمسار ہوئے اور روتے ہوئے ایک دوسرے کو گلے لگا لیا۔[43]

مدینہ کے سبھی مسلمان تبدیلی کے لیے پرعزم نہ تھے۔ کچھ ایک نے صرف مادی فائدے کی خاطر اسلام قبول کیا تھا اور وہ اس نئی مہم جوئی کے مفید نتائج کا انتظار کر رہے تھے۔ قران نے ان لوگوں کو ''منافقون'' کہا کیونکہ وہ مخلص نہیں تھے اور اپنے ارادے بدلتے رہتے تھے۔[44] راسخ مسلمانوں کے درمیان موجود ہونے پر وہ کہتے: ''تمہاری طرح ہم بھی ایمان لائے ہیں،'' لیکن دیگر متشککین کی محفل میں وہ انہیں یقین دلاتے: ''ہم تمہارے ساتھ ہیں؛ ہم تو محض دکھاوا کر رہے ہیں۔''[45] ان کا قائد ابوابیعہ تھا جس نے اسلام تو قبول کر لیا لیکن نئے عقیدے پر خفگی کا اظہار اور تنقید کرتا رہا۔ آنحضرتؐ ہمیشہ اس کے ساتھ عزت سے پیش آئے اور اسے جمعہ کی نماز کے دوران ہفتہ وار خطاب کی اجازت دی، لیکن اس کی مخفی رقابت وقتاً فوقتاً سامنے آتی رہی۔ ایک ناخوش گوار واقعہ کے بعد انصار میں سے ایک شخص نے حضرت محمدؐ سے درخواست کی، ''اس پر سختی نہ کریں، کیونکہ اللہ کی جانب سے آپؐ کی بعثت سے پہلے ہم اسے تاج پہنانے کی تیاری کر رہے تھے، اور خدا کی قسم وہ سمجھتا ہے کہ آپؐ نے اس سے بادشاہت چھین لی ہے۔''[46]

کچھ یہودی نو واردگان کے دشمن بننے لگے تھے۔ آنحضرتؐ انہیں مسلمان بنانے کی امید نہیں رکھتے تھے اور ان کے ساتھ آپؐ کا تنازع مذہبی نہیں بلکہ سیاسی اور معاشی نوعیت کا تھا۔ نخلستان میں یہودیوں کی حیثیت کو دھچکا پہنچا، اور اگر حضرت محمدؐ اوس وخزرج کو متحد کرنے میں کامیاب ہو جاتے

توانہیں اپنی سابقہ برتر حیثیت دوبارہ حاصل کرنے کا کوئی موقعہ نہ ملتا۔ چنانچہ تین بڑے یہودی قبائل نے ابن ابیعہ اور نخلستان میں حضرت محمدؐ کے مخالف بت پرست عربوں کا ساتھ دینا دانش مندی خیال کیا۔[47] ابتدائی مسلمان مؤرخین ہمیں بتاتے ہیں کہ انہوں نے قرآن کی الٰہیات کے خلاف دانشورانہ محاذ آرائی شروع کی، لیکن یہ غالباً آٹھویں اور نویں صدیوں کے دوران یہودی۔مسلم بحث کی انعکاس ہے۔[48] ساتویں صدی کے مدنی یہودی توریت اور تالمود کا محض محدود علم ہی رکھتے تھے، وہ راسخ العقیدہ نہیں تھے اور اپنے عقیدے کو عربی مذہب کی ہی ایک تبدیل شدہ صورت خیال کیا کرتے تھے۔[49] ایک عرب پیغمبر کا تصور ان کے لیے انوکھا نہیں تھا: ان کا ابن سید نامی ایک اپنا پیغمبر تھا جو عبا پہنتا، الہامی آیات پڑھتا اور خدا کا نبی ہونے کا دعویٰ کرتا تھا۔[50]

لیکن اگر کوئی عالمانہ ربانی مباحث موجود نہ تھے تو مسلمانوں کو غالباً مدینہ میں کافی سنگین عوامی مذہبی شاؤنیت کا سامنا کرنا پڑا۔ ابن اسحٰق ہمیں بتاتا ہے کہ کچھ یہودی مسجد میں داخل ہونے پر قرآن کا ٹھٹھہ اڑاتے۔[51] متعدد یہودی دوستانہ تھے اور حضرت محمدؐ نے ان سے کافی کچھ سیکھا، لیکن اہل کتاب کے کچھ نظریات کو آپؐ نے واقعی بہت عجیب وغریب پایا۔ ایک تخصیص پسند مذہب کا تصور حضرت محمدؐ کے لیے اجنبی تھا؛ آپؐ فرقہ ورانہ جھگڑوں سے نفرت کرتے تھے،[52] اور ''منتخب بندوں'' کے تصور یا صرف یہودیوں یا عیسائیوں کے جنت میں جانے کا خیال ناپسند فرمایا۔[53] آپؐ یہ جان کر بھی حیران ہوئے کہ کچھ عیسائی خدا کو تثلیث اور یسوع کو ابن اللہ مانتے تھے۔[54] لیکن آپؐ اس رائے پر قائم رہے کہ یہ مخصوص تصورات ایک گمراہ اقلیت کے ملحدانہ انحرافات تھے۔[55] قرآن نے مسلمانوں کو یاد دلایا کہ بہت سے اہل الکتاب ''راست باز لوگ'' تھے:

> اہل الکتاب میں ایک فرقہ ہے سیدھی راہ پر، پڑھتے ہیں آیتیں اللہ کی راتوں کے وقت اور وہ سجدے کرتے ہیں، ایمان لاتے ہیں اللہ پر اور قیامت کے دن پر اور حکم کرتے ہیں اچھی بات کا اور منع کرتے ہیں برے کاموں سے اور دوڑتے ہیں نیک کاموں پر اور وہی لوگ ہیں نیک بخت۔[56]

مسلمانوں کو یاد رکھنا ضروری تھا کہ ہر ایک امت کا اپنا اپنا الہامی دین تھا، چنانچہ انہیں ان بے

معنی بحثوں میں نہیں الجھنا چاہیے تھا؛ اگر اہل الکتاب ان کے عقیدے پر حملہ کرتے تو مسلمانوں کو حلم سے کام لینا اور خوش اخلاقی سے جواب دینا تھا: ''خدا بخوبی جانتا ہے کہ تم کیا کر رہے ہو۔''(57)

اس بے سود اختلاف سے گریز کرنے کی خاطر آنحضرتؐ نے (حنیفوں کی طرح) دین ابراہیم کی طرف واپسی کا فیصلہ کیا جو نہ یہودی تھے اور نہ عیسائی، کیونکہ ان کا دور توریت یا انجیل سے بہت پہلے کا تھا۔(58) ہجرت کے بعد قرآن نے مسلمانوں اور اسلام کے لیے ''حنیف'' اور ''حنیفیہ'' کی اصطلاحات استعمال کیں، لیکن انہیں ایک نیا مفہوم دیا۔ حضرت محمدؐ کے لیے حنیفیہ کا مطلب محض اللہ کی کامل اطاعت تھا۔ پیغمبروں کا اصل پیغام یہی تھا، جسے فرقہ پرست شاونیت نے بگاڑ دیا۔ مثلاً حضرت ابراہیمؑ کسی واحد مسلک سے تعلق نہیں رکھتے تھے۔ وہ محض ایک مسلم (اطاعت گزار) اور حنیف (خالص عقیدے کے پیروکار) تھے۔(59) جب ابراہیمؑ اور اسمٰعیلؑ نے مل کر کعبہ کی تعمیرِ نو کی تو انہوں نے کوئی مخصوص الٰہیات نہیں بنائی تھی، بلکہ وہ تو محض اپنی زندگیاں اللہ کے سپرد کرنا چاہتے تھے۔ انہوں نے دعا کی، ''اے ہمیں پالنے والے، ہمیں اپنا اطاعت گزار بنا اور ہمیں عبادت کا درست طریقہ سکھا۔'' مسلمان مذہبی عدمِ برداشت کی وجہ سے مکہ بدر ہوئے تھے، سو انہیں تخصیص پسندی سے اجتناب کرنا ضروری تھا۔(60) سچائی پر اجارہ داری کا دعویٰ کرنے کی بجائے سچے مسلمانوں نے بس اتنا کہا، ''تو کہہ دے، مجھ کو سمجھائی میرے رب نے راہ سیدھی دین صحیح ملت ابراہیم کی جو ایک ہی طرف کا تھا۔ تو کہہ میری نماز اور میری قربانی اور میرا جینا اور میرا مرنا اللہ ہی کے لیے ہے، جو پالنے والا ہے سارے جہان کا۔''(61) صرف اللہ پر توجہ مرکوز کرنے کی بجائے کسی مخصوص مذہبی روایت سے تعلق پر فخر کرنا بت پرستی تھی۔

جنوری 624ء کے آخر میں حضرت محمدؐ جمعہ کی نماز پڑھا رہے تھے کہ آپؐ پر ایک وحی نازل ہوئی، اور آپؐ نے جماعت کا قبلہ یروشلم کی بجائے مکہ کی طرف کر دیا۔ اب مسلمانوں کا رخ حضرت ابراہیمؑ کے تعمیر کردہ خانۂ کعبہ کی طرف تھا۔

بے شک ہم دیکھتے ہیں بار بار اٹھنا تیرے منہ کا آسمان کی طرف، سو البتہ پھیریں گے ہم تجھ کو جس قبلہ کی طرف تو راضی ہے۔ اب پھیر منہ اپنا طرف مسجد

الحرام کے اور جس جگہ تم ہوا کرو پھیرو منہ اسی کی طرف۔[62]

یہ اس بات کی یاد دہانی تھی کہ وہ کسی مقبول مذہب کی نہیں بلکہ اللہ کی اطاعت کر رہے تھے۔ یہ ایک قسم کا اعلان آزادی تھا۔ اب مسلمانوں کو یہ محسوس کرنے کی ضرورت نہ تھی کہ وہ پرانے مذاہب پر ہی عمل کر رہے ہیں۔ اللہ نے فرمایا، ''اور مجھ سے ڈرو اور اس واسطے کہ کامل کروں تم پر فضل اپنا۔''[64] نئے قبلہ نے انصار و مہاجرین دونوں کو خوش کر دیا اور انہیں ایک دوسرے کے ساتھ مضبوط بندھن میں بھی باندھا۔ وہ سب کعبہ سے محبت کرتے تھے جو دور دراز شہر یروشلم کی نسبت عرب روایت میں کہیں گہری اساس رکھتا تھا۔ لیکن ایک مسئلہ تھا۔ خانۂ کعبہ مکہ میں تھا اور قریش کے ساتھ تعلقات حال ہی میں بدترین صورت اختیار کر چکے تھے۔

باب 4

جہاد

بے یقینی کا دور ختم ہونے پر قبلہ کی تبدیلی واقع ہوئی تھی۔ حضرت محمدؐ اور اُمت کسی راہنمائی کے انتظار میں تذبذب کے ساتھ کبھی اس اور کبھی اُس طرف منہ پھیرتے رہے۔ آنحضرتؐ جانتے تھے کہ پیغمبر کا کام دنیا میں تبدیلی لانا ہے۔ آپؐ محض مرکزی دھارے سے باہر کھڑے نہیں رہ سکتے تھے۔ آپؐ نے الوہی احکام کو عملی صورت دی اور ایک منصفانہ، مساواتی معاشرہ تخلیق کیا، لیکن ہجرت نے مسلمانوں کو غیر اہم اور نامانوس حیثیت سے دوچار کر دیا تھا۔ اگرچہ آنحضرتؐ نے اپنی سماجی اصلاحات نافذ کرنا شروع کر دی تھیں، لیکن آپؐ جانتے تھے کہ جب تک آپؐ مدینہ تک ہی محدود اور کٹے ہوئے رہیں گے تب تک عرب دنیا پر کوئی پائیدار نقش مرتب کرنا ممکن نہیں ہوگا۔ اُم البلاد مکہ جزیرہ نما کی خوشحالی کا محور تھا۔ عرب کو قریش کے تجارتی جینیئس کی ضرورت تھی۔ مکہ مسلم دنیا کا مرکز بن گیا تھا۔ وہ ہر روز کی طرف منہ کر کے متعدد مرتبہ اس نماز پڑھتے اور دعائیں کرتے، لیکن

وہ ایک غیر حاضر اور نا قابلِ رسائی محبوب جیسا معلوم ہونے لگا تھا۔[1] حتیٰ کہ مسلمان دیگر عربوں کی طرح حج بھی نہیں کر سکتے تھے۔ حضرت محمدؐ نے محسوس کیا کہ مکہ کلید کامیابی تھا۔ قریش کی جارحیت نے امت کو قبائلی نقشے سے مٹا کر سیاسی طور پر منفعل بنا دیا تھا۔ مکہ کے بغیر اسلام محض حاشیہ نشین ہی رہتا۔ آنحضرتؐ کے لیے ضروری تھا کہ وہ کسی نہ کسی طرح اپنے لوگوں کے ساتھ صلح کریں، لیکن ہجرت کے پہلے دھچکے کے بعد لگتا تھا کہ زیادہ تر قریش مسلمانوں کو بھول گئے تھے۔ مکہ کے ساتھ صلح کا آغاز کرنے سے قبل ضروری تھا کہ آنحضرتؐ قریش کو مسلمانوں کی اہمیت کا احساس دلائیں۔

آپؐ کو مدینہ میں بھی اپنی حیثیت مستحکم بنانا تھی۔ آپؐ جانتے تھے کہ جہاں تک بیشتر مدنیوں کا تعلق ہے تو وہ ابھی تک آپؐ کو آزما رہے تھے۔ انہوں نے مہاجرین کو قبول کر کے قریش کی طاقت کو مسترد کیا تھا، کیونکہ وہ کوئی مادی فائدہ چاہتے تھے، اور یہاں بھی حضرت محمدؐ انہیں یہ فائدہ دلا سکتے تھے۔ اور کچھ نہیں تو آپؐ کو انہیں یہ یقین دہانی کروانا تھی کہ مہاجرین معیشت پر بوجھ نہیں بنیں گے۔ لیکن ان کے لیے روزی کمانا ایک مسئلہ تھا۔ ان میں سے زیادہ تر تاجر یا بینک کار تھے، لیکن مدینہ میں کاروباری مواقع بہت کم تھے اور امیر کبیر عرب اور یہودی قبائل نے اجارہ قائم کر رکھا تھا۔ مہاجرین کو کاشت کاری کا کوئی تجربہ نہ تھا، اور بہر صورت تمام دستیاب زمین پہلے سے مقبوضہ تھی۔ اگر وہ کوئی خود انحصار ذریعۂ آمدن تلاش نہ کرتے تو انصار پر بوجھ بن جاتے اور یہ مقصد حاصل کرنے کا ایک بیّن ذریعہ موجود تھا۔

مدینہ ایسی موزوں جگہ پر واقع تھا کہ شام جاتے اور واپس آتے ہوئے مکی تجارتی قافلوں پر بہ آسانی حملہ کیا جا سکتا تھا۔ آنحضرتؐ نے مدینہ پہنچنے کے کچھ ہی عرصہ بعد مہاجرین کے دستوں کو حملے کی مہمات پر بھیجنا شروع کر دیا۔[2] ان کا مقصد خونریزی نہیں، بلکہ اونٹ، مالِ تجارت اور قیدی حاصل کرنے کے ذریعۂ آمدنی پیدا کرنا تھا (قیدیوں کا فدیہ حاصل کیا جا سکتا تھا۔) اس پیش رفت نے کسی کو خصوصی طور پر حیران نہ کیا۔ مشکل حالات میں غزو معمول کی مہم تھی، البتہ کچھ عرب طاقتور قریش کے ساتھ الجھنے میں مسلمانوں کی جرأت پر ضرور حیران ہوئے ہوں گے، بالخصوص اس لیے کہ وہ واضح طور پر نا تجربہ کار جنگجو تھے۔ ہجرت کے بعد پہلے دو برس کے دوران حضرت محمدؐ نے اس

قسم کی آٹھ مہمات روانہ کیں۔ آپؐ بذات خود ان میں شریک نہ ہوئے بلکہ حضرت حمزہؓ اور حضرت عبیدہؓ ابن الحارث جیسے افراد کو نمائندہ بنا کر بھیجا، لیکن تجارتی قافلوں کے گزرنے کے متعلق درست معلومات حاصل کرنا مشکل تھا اور کوئی بھی ابتدائی مہم کامیاب نہ ہوئی۔

قریش جنگ پسند لوگ نہیں تھے۔ وہ کافی عرصہ قبل خانہ بدوشی کی زندگی ترک کر چکے تھے اور انہوں نے غزو کی عادت اور مہارت دونوں کھو دی تھیں۔ قرآن دکھاتا ہے کہ کچھ ایک مہاجرین نے لڑائی کے خیال کو ناپسند کیا۔[3] لیکن آنحضرتؐ نے ہمت نہ ہاری۔ اگرچہ مہاجرین آمدنی حاصل کرنے کے شدید خواہش مند تھے، لیکن لوٹ مار بنیادی مقصد نہیں تھا۔ حملہ آور پارٹی کے لوگ خالی ہاتھ بھی واپس آتے، لیکن انہوں نے کم از کم مکہ کی توجہ مسلمانوں کی جانب مبذول کروا دی تھی۔ قریش سیخ پا ہوئے۔ انہیں ایسی احتیاطی تدابیر کرنا پڑیں جو پہلے کبھی نہیں کی تھیں۔ تاجروں نے خود کو زیادہ زد پذیر محسوس کیا؛ انہیں دشوار راستے اپنانا پڑے اور مکہ میں مالِ تجارت کی آمد و رفت میں کچھ خلل پیدا ہوا۔ ستمبر 623ء میں آنحضرتؐ بہ نفسِ نفیس غزو لے کر ایک کاروان کے خلاف گئے جس کا قائد امیہ ابن خلف تھا۔ مالِ غنیمت اس قدر پرکشش معلوم ہوا کہ 200 مسلمان رضا کارانہ مہم میں شامل ہوئے، لیکن ایک مرتبہ پھر کاروان بچ نکلا اور کوئی لڑائی نہ ہوئی۔

ستپیوں میں غزو کے لیے کوئی نظری توجیہ درکار نہ تھی۔ اسے دورِ احتیاج میں ایک ناگزیر ضرورت سمجھا جاتا تھا۔ حضرت محمدؐ نے پرانے قبائلی دساتیر سے ماورا ہونے کا عزم کر رکھا تھا۔ قرآن نے مسلمانوں کو کافروں کے ساتھ ''امن قائم کرنے'' اور کاروبار کے دوران ان پر حملہ نہ کرنے کی ہدایت کی تھی۔ حضرت محمدؐ کی مدینہ آمد کے کچھ ہی عرصہ بعد آپؐ کو ایک وحی موصول ہوئی جس میں نسبتاً زیادہ عسکری انداز اپنانے کو کہا گیا تھا:

> اللہ دشمنوں کو ہٹا دے گا ایمان والوں سے۔ اللہ کو خوش نہیں آتا کوئی دغاباز کوئی ناشکر۔ حکم ہوا ان لوگوں کو جن سے کافر لڑتے ہیں، اس واسطے کہ ان پر ظلم ہوا اور اللہ ان کی مدد کرنے پر قادر ہے۔ وہ لوگ جن کو نکالا ان کے گھروں سے اور دعویٰ کچھ نہیں سوائے اس کے کہ وہ کہتے ہیں ہمارا رب اللہ ہے۔

اور اگر نہ ہٹایا کرتا اللہ لوگوں کو، ایک کو دوسرے سے تو ڈھائے جاتے تکیے اور
مدرسے سے عبادت خانے اور مسجدیں جن میں نام پڑھا جاتا ہے اللہ کا بہت۔
اور اللہ مقرر مدد کرے گا اس کی جو مدد کرے گا اس کی۔ بے شک اللہ زبردست
ہے زور والا۔[4]

قرآن نے ایک قدیمی منصفانہ جنگ کا نظریہ وضع کرنا شروع کر دیا تھا۔ سٹیپیوں میں جارحانہ جنگ و جدل قابلِ ستائش تھی، لیکن قرآن میں اپنا دفاع دشمنیوں کے لیے واحد ممکنہ توجیہ تھا اور حملے میں پہل کرنا برا سمجھا جاتا تھا۔[5] جنگ ہمیشہ سے دہشت ناک تھی، لیکن کبھی کبھی یہ آزادیٔ پرستش جیسی کسی شائستہ قدر کو محفوظ رکھنے کے لیے لازمی ہو جاتی۔ یہاں بھی قرآن نے اپنی اجتماعیت پسندی کو ترک نہ کیا: مساجد کے ساتھ ساتھ کنیساؤں اور گرجا گھروں کا تحفظ بھی ہونا چاہیے تھا۔ مسلمانوں نے محسوس کیا کہ ان پر ایک خوفناک حملہ ہوا تھا؛ ان کی مکہ بدری ایک ناقابلِ توجیہ اقدام تھا۔ قبیلے سے اخراج عرب کی عمیق ترین حرمت کی خلاف ورزی تھا؛ اس نے مسلم شناخت کے مرکز کو نشانہ بنایا۔

لیکن حضرت محمدؐ ایک خطرناک راہ پر نکل کھڑے ہوئے تھے۔ وہ ایک نہایت متشدد معاشرے میں رہتے تھے اور آپؐ کی نظر میں یہ حملے محض حصولِ آمدنی کا ذریعہ ہی نہیں، بلکہ قریش کے ساتھ جھگڑا چکانے کا طریقہ بھی تھے۔ ہم نے اپنے دور میں بھی دیکھا ہے کہ امن کی خاطر جنگ کرنا ایک خطرناک مہم جوئی ہے۔ جنگ کی بہیمیت ایسے اقدامات پر منتج ہو سکتی ہے کہ عین انہی اصولوں کی دھجیاں اڑ جائیں جن کے لیے جنگ شروع کی گئی تھی اور انجام کار کوئی بھی فریق برتر اخلاقی بنیاد کا دعویٰ نہ کر سکے۔ مسلمانوں نے اپنے غزوہ کو اخلاقی بنیاد فراہم کرنا چاہی لیکن آپؐ طویل عسکری مہم کا کوئی تجربہ نہیں رکھتے تھے۔ آپؐ کو پتا چلا کہ تشدد کا چکر ایک مرتبہ شروع ہو جائے تو اس کی رفتار بڑھتی جاتی ہے اور یہ قابو سے باہر ہو سکتا ہے۔

شروع میں آنحضرتؐ نے روایتی اصول و ضوابط کے تحت جنگ لڑی، لیکن جنوری 624ء میں تبدیلیٔ قبلہ سے کچھ ہی عرصہ قبل، آپؐ کو جنگ و جدل کے اچانک پن کا اولین تجربہ ہوا۔[6]

مہاجرین زیادہ پُر اعتماد ہو گئے تھے۔ موسم سرما کے مہینوں میں قریش نے اپنے تجارتی قافلے جنوب کی طرف بھیجے، لہٰذا اب انہیں مدینہ کے قریب سے نہیں گزرنا پڑتا تھا، لیکن انہیں اپنی اہمیت کا احساس دلانے کی خاطر آنحضرتؐ نے 9 آدمیوں پر مشتمل ایک چھوٹے سے دستے کو جنوب کی طرف رواں تجارتی قافلے پر حملہ کرنے بھیجا۔ یہ ماہِ رجب کا آخر تھا۔ ''مقدس مہینوں'' میں سے ایک جب ہر قسم کی جنگ و جدل حرام تھی۔ رجب کی آخری تاریخ کو مسلمان نخلہ میں خیمہ زن ایک چھوٹے سے کاروان کے قریب پہنچے۔ اگر وہ اگلے روز تک انتظار کرتے تو قافلہ صحیح سلامت مکہ پہنچنے میں کامیاب ہو جاتا۔ انہوں نے حملے کا فیصلہ کیا۔ پہلے تیر نے ایک تاجر کی جان لی، بقیہ میں سے زیادہ تر بھاگ گئے، لیکن مسلمانوں نے دو قیدی بنائے اور مالِ غنیمت کے ہمراہ انہیں واپس مدینہ لے آئے۔

لیکن مسلمان اس پارٹی کا استقبال بطور فاتحین کرنے کی بجائے یہ سن کر بہت دہشت زدہ ہوئے کہ کارروائی نے مقدس مہینے کی خلاف ورزی کی ہے۔ آنحضرتؐ چند روز تک اس معاملے پر غور کرتے رہے۔ آخر آپؐ نے ملی مذہب کے دساتیر کو ٹھکرایا تھا اور تصور کیا ہو گا کہ ممنوع مہینوں کی خلاف ورزی بھی کی جا سکتی ہے۔ کارروائی کامیاب رہی تھی۔ نہ صرف کافی مال ہاتھ آیا بلکہ قریش پر عیاں ہو گیا کہ آپؐ ان کے گھر کی تقریباً دہلیز پر بھی ان کے خلاف حملہ کر سکتے تھے۔ آپؐ نے بہت سے مدنیوں کو بھی متاثر کیا۔ لیکن اس سارے معاملے کچھ ابہام پایا جاتا تھا۔ آنحضرتؐ نے اس سے پہلے کبھی بھی حرمت والے مہینوں کے دستور پر تنقید نہیں کی تھی۔ مستند تاریخی کتب اس واقعے کے متعلق کچھ گڑبڑاہٹ کا شکار لگتی ہیں۔ آپؐ کو پتا چلا تھا کہ جنگ ابتدا میں چاہے کتنی ہی تخیل پسندانہ کیوں نہ ہو، لیکن جلد یا بدیر کچھ ناپسندیدہ واقع ہونے لگتا ہے۔

انجام کار حضرت محمدؐ پر ایک نئی وحی نازل ہوئی جس نے آپؐ کی منصفانہ جنگ کے مرکزی اصول کو دہرایا۔ جی ہاں، حرمت والے ایام کی خلاف ورزی کرنا غلط تھا، لیکن مسلمانوں کو ان کے گھروں سے نکالنے کے لیے قریش کی پالیسی اور بھی زیادہ سنگین جرم تھی۔ قرآن نے آنحضرتؐ کو خبردار کیا: ''وہ اس وقت تک تم سے لڑنا بند نہیں کریں گے جب تک تمہیں تمہارے دین سے پھیر نہ دیں۔'' جہاں تک حرام مہینے میں لڑائی کا تعلق ہے تو یہ یقیناً ایک ''خوفناک بات'' تھی۔

اور روکنا اللہ کی راہ سے اور اس کو نہ ماننا اور مسجد الحرام سے روکنا اور نکال دینا اس کے لوگوں کو وہاں سے اس سے بھی زیادہ گناہ ہے اللہ کے نزدیک۔ اور لوگوں کو دین سے بچلانا قتل سے بھی بڑھ کر ہے۔[7]

چنانچہ حضرت محمدؐ نے مالِ غنیمت قبول فرمایا اور امت کو تسلی دی؛ آپؐ نے مالِ غنیمت کو مہاجرین میں مساوی تقسیم کیا اور قیدیوں کے تبادلے کے لیے قریش کے ساتھ مذاکرات کرنے لگے۔ آپؐ نے مکہ میں باقی رہ گئے ہر دو مسلمانوں کے بدلے میں ایک قیدی واپس کرنے کی شرط رکھی۔ لیکن ایک قیدی مدینہ میں دیکھے ہوئے حالات سے اس قدر متاثر ہوا کہ وہیں رہنے اور اسلام قبول کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ یہ واقعہ حضرت محمدؐ کے کام کرنے کے ابتدائی انداز کی ایک اچھی مثال تھا۔ اپنی انوکھی حیثیت میں آپؐ محض روایتی طریقہ کار پر بھروسہ نہیں کر سکتے تھے۔ آپؐ قدم بہ قدم آگے بڑھ رہے تھے، پیش آمدہ حالات کو نظر میں رکھتے ہوئے۔ آپؐ کا کوئی طے شدہ عظیم منصوبہ نہیں تھا، اور اپنے کچھ جوشیلے ساتھیوں کے برعکس آپؐ نے شاذونادر ہی کسی بحران پر فوری ردِعمل دیا، بلکہ اچھی طرح سوچ بچار کرتے رہے — یہاں تک کہ کوئی القائی حل سامنے آ گیا۔

چند ہفتے بعد، ماہ رمضان (مارچ 624ء) کے دوران حضرت محمدؐ مسلمانوں کا ایک بڑا دستہ ساتھ لے کر ایک مکی تجارتی قافلے کی راہ روکنے گئے جسے ابوسفیان شام سے واپس لا رہا تھا۔[8] یہ سال کے اہم ترین تجارتی قافلوں میں سے ایک تھا، اور نخلہ میں کامیابی سے حوصلہ پا کر انصار کی ایک بڑی جماعت رضا کارانہ طور پر حملے میں شامل ہوئی۔ تقریباً 314 مسلمان مدینہ سے روانہ ہوئے اور بحیرۂ احمر کے ساحل کے قریب بدر کے کنوئیں تک گئے جہاں قافلے پر حملہ کرنے کے لیے گھات لگائی۔ یہ مہم اسلام کی ابتدائی تاریخ کے نہایت فیصلہ کن واقعات میں سے ایک تھی، لیکن ابتدا میں یہ محض ایک اور غزوہ ہی معلوم ہوئی اور نہایت پُرعزم مسلمانوں میں سے متعدد گھر پر ہی رہے، بشمول حضرت عثمانؓ بن عفان جن کی زوجہ رقیہؓ بنت محمدؐ شدید بیمار تھیں۔

شروع میں یوں لگا جیسے کاروان معمول کے مطابق بچ نکلے گا۔ ابوسفیان کو مسلمانوں کے منصوبے کی خبر مل گئی اور اس نے حجاز سے ہو کر گزرنے والا معمول کا راستہ چھوڑ کر ساحل سے ایک دم رخ موڑا اور ایک مقامی قبائلی شخص کی مدد لیتے مکہ روانہ کیا۔ قریش مسلمانوں کی گستاخی پر بہت

غضب ناک ہوئے اور اسے اپنی بے عزتی خیال کیا۔ تمام سرکردہ افراد نے قافلے کو بچانے کا تہیہ کیا۔ یقیناً ابوجہل مسلمانوں سے لڑنے کے لیے بے قرار تھا۔ امیہ ابن خلف پوری طرح مسلح ہوا اور حضرت محمدؐ کے اپنے خاندان کے افراد آپؐ کے خلاف روانہ ہوئے۔ ان کا خیال تھا کہ اس مرتبہ مسلمانوں نے ہر حد پار کر لی ہے۔ ابولہب بیمار تھا، لیکن ابوطالب کے دو بیٹے، آنحضرتؐ کے چچا عباس اور حضرت خدیجہؓ کا بھتیجا حاکم، ہزاروں آدمیوں کے ہمراہ اسی رات مکہ سے روانہ ہوئے اور بدر کی راہ لی۔

دریں اثناء، ابوسفیان مسلمانوں کو دھوکا دینے اور قافلے کو ان کی پہنچ سے باہر نکالنے میں کامیاب ہوگیا۔ اس نے اطلاع بھیجی کہ سامان محفوظ ہے اور فوج کو واپس چلے جانا چاہیے۔ مستند روایات سے واضح ہے کہ اس موقعہ پر بہت سے قریش اپنے رشتہ داروں کے ساتھ لڑنے سے گریزاں تھے، لیکن ابوجہل ان لوگوں میں سے نہیں تھا۔ وہ بولا، ''اللہ کی قسم! ہم بدر ضرور جائیں گے۔ ہم تین دن وہاں گزاریں گے، اونٹ ذبح کریں گے، جشن منائیں گے اور شراب نوشی کریں گے؛ اور لڑکیاں ہمارے لیے رقص پیش کریں گی۔ عربوں کو پتا چلے گا کہ ہم وہاں آئے تھے اور وہ آئندہ ہمارا احترام کریں گے۔''[9] لیکن ان پرغرور الفاظ سے اندازہ ہوتا ہے کہ ابوجہل کو بھی جنگ کی توقع نہیں تھی۔ وہ جنگ کی دہشت ناکی کا بہت کم ادراک رکھتا تھا۔ اس کے خیال میں یہ ایک قسم کی دعوت یا ضیافت تھی جس میں رقاصائیں بھی موجود ہونی چاہیے تھیں۔ قریش سپاہیوں سے اس قدر دور تھے کہ جنگ وجدل ایک جنگجوئی تفریح بن گئی جو مکہ کا وقار بڑھاتی۔

مسلم پڑاؤ میں ایک بالکل مختلف قسم کا جذبہ موجزن تھا۔ ہجرت کے صدمے اور مشکلات کے بعد مہاجرین صورت حال کو اس قدر لاپروائی اور اعتماد کے ساتھ نہیں دیکھ سکتے تھے۔ حضرت محمدؐ نے مکی فوج کی روانگی کا سنتے ہی دیگر سرداروں سے مشورہ کیا۔ مسلمانوں کی تعداد بہت کم تھی۔ انہیں بھرپور لڑائی کی بجائے ایک معمول کی جھڑپ کی امید تھی۔ آنحضرتؐ سپہ سالار نہیں تھے؛ آپؐ کو جنگجوؤں پر اختیار بھی حاصل نہیں ہوسکتا تھا، لیکن لوگوں نے قدم آگے بڑھانے کا فیصلہ کیا۔ جیسا کہ سعد ابن معاذ نے انصار کے ایماء پر کہا:

ہم نے آپ کو وعدہ اور حلف دیا ہے کہ ہم آپ کی بات سنیں اور مانیں گے؛ اس

> لیے آپ جہاں جانا چاہتے ہیں چلیں، ہم آپ کے ساتھ ہیں اور خدا کی قسم، اگر آپ نے ہمیں یہ سمندر پار کرنے کا کہا اور خود اس میں اتر گئے تو ہم بھی آپ کے پیچھے اس میں اتر پڑیں گے۔ ہم کل آپ کے دشمن کا مقابلہ کرنے کا خیال ناپسند نہیں کرتے۔ ہم جنگ میں تجربہ کار اور لڑائی میں قابل بھروسہ ہیں۔ (10)

قریش کے برعکس اوس اور خزرج مشاق سپاہی تھے۔ انہیں یثرب میں قبائلی جنگ و جدل کا پختہ تجربہ تھا۔ اس کے باوجود صورت حال قطعی بے جوڑ تھی اور تمام مسلمانوں کو امید تھی کہ انہیں لڑنا نہیں پڑے گا۔ دونوں فوجیں دو دن تک ایک دوسرے کو گھورتی رہیں اور وادی کے مقابل کونوں پر آمنے سامنے خیمہ زن تھیں۔ قریش اپنے سفید عماموں اور چمکتی ہوئی زرہوں میں بہت متاثر کن لگ رہے تھے؛ اور سعد ابن معاذ کی تحریک انگیز تقریر کے باوجود کچھ مسلمان پسپائی اختیار کرنا چاہتے تھے۔ مسلمانوں کے پڑاؤ میں سراسیمگی پائی جاتی تھی۔ آنحضرتؐ نے ان کے حوصلے بلند کرنے کی کوشش کی۔ آپؐ نے انہیں ایک خواب کے متعلق بتایا جس میں اللہ نے ایک ہزار فرشتے لڑائی میں مدد کے لیے بھیجنے کا وعدہ کیا تھا۔ (11) مسلمانوں کے ہتھیار پھینکنے کے بارے میں پُریقین قریش دعوتیں اڑانے اور ناؤ نوش میں مصروف تھے جبکہ حضرت محمدؐ عملی تیاریاں کرنے لگے۔ آپؐ نے اپنے دستوں کو کنوؤں کے قریب صف آرا کیا تاکہ قریش پانی حاصل نہ کر سکیں۔ آپؐ نے صف بندی اس انداز میں کی کہ قریش کو پہاڑی کے اوپر چڑھ کر لڑنا پڑے اور سورج سیدھا ان کی آنکھوں میں پڑے۔ لیکن کثیر التعداد مکی فوج کو دیکھ کر آپؐ نے اشکبار آنکھوں کے ساتھ دعا کی: ''اے اللہ، اگر میرے ساتھ موجود یہ دستہ صفحۂ ہستی سے مٹ گیا تو پھر تیری عبادت کرنے والا کوئی نہ رہے گا۔ تمام اہلِ ایمان سچے مذہب کو چھوڑ دیں گے۔ (12) آپؐ نے محسوس کیا کہ یہ جنگ فیصلہ کن ہوگی۔ اگر مسلمان قریش کو چڑھائی کرنے اور خود کو مدینہ کی طرف واپس دھکیلنے کی اجازت دے دیتے تو امت عرب پر کوئی پائیدار اثرات مرتب نہ کر سکتی۔ آپؐ کا مصمم ارادہ آدمیوں تک پہنچنا ضروری تھا۔ قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ اس دہشت انگیز لمحے میں کس طرح آپؐ کے سپاہی بالکل مطمئن ہو گئے۔ اچانک طوفان باد و باراں آیا جو ایک نیک شگون تھا۔ (13)

دریں اثناء، قریش زیادہ خبردار ہوگئے تھے۔ سرداروں نے دشمن افواج کے متعلق معلوم کرنے کے لیے ایک جاسوس بھیجا۔ وہ مسلمانوں کے چہروں پر عزمِ صمیم دیکھ کر حیران رہ گیا اور قریش سے درخواست کی کہ جنگ سے باز رہیں۔ اس نے ''اونٹوں پہ سوار موت دیکھی ــ یثرب کے اونٹ جن پر موت سوار تھی۔'' مسلمانوں میں سے ایک بھی شخص کم از کم ایک مکی کو مارے بغیر مرنے والا نہیں تھا۔ جاسوس نے مایوس کن انداز میں کہا کہ اس سب کے بعد قریش خود کیسے جئیں گے؟ انہیں متواتر ایک پڑوسی کا سامنا کرنا پڑے گا جس نے ان کے رشتہ داروں میں سے کسی ایک کو مارا ہوگا، لیکن ابوجہل نے اسے بزدل قرار دیا ــ ایک ایسا طعنہ جو کوئی بھی عرب برداشت نہیں کرتا۔ وہ نخلہ میں مسلم حملہ آوروں کے ہاتھوں قتل ہونے والے شخص کے بھائی کی طرف مڑا جس نے وحشیانہ جنگی پکار بلند کی۔ ابن اسحٰق کہتا ہے، ''فوراً جنگ کی چنگاری بھڑک اٹھی اور سب لوگ شہر کے راستے پر نکل کھڑے ہوئے۔''(14) قریش نے ریت کے ٹیلوں پر آہستہ آہستہ آگے بڑھنا شروع کیا۔ آنحضرتؐ نے قرآن کے حکم پر عمل کرتے ہوئے پہلے حملہ کرنے سے انکار کر دیا اور حتیٰ کہ جنگ شروع ہونے کے بعد بھی آپؐ اس وقت تک اپنے آدمیوں کو آگے بڑھنے کا حکم دینے میں متامل نظر آئے جب تک حضرت ابوبکرؓ نے آکر آگے بڑھنے کا مشورہ نہ دے دیا، کیونکہ اللہ نے فتح کو یقینی بنا دیا تھا۔

نتیجتاً ہونے والی شدید لڑائی میں قریش کو جلد ہی معلوم ہوگیا کہ ان کی حالت پتلی ہے۔ وہ لاپروائی سے لڑے، کہ جیسے یہ کوئی شہسواروں کا تماشا ہو، اور کوئی ٹھوس حکمت عملی نہ بنائی۔ لیکن مسلمانوں کے پاس ایک منظم منصوبہ تھا۔ انہوں نے دشمن پر تیروں کی بارش سے آغاز کیا اور آخری لمحے میں ہی دست بدست لڑائی کے لیے تلواریں بے نیام کیں۔ دوپہر کے وقت قریش بدنظمی کے عالم میں بھاگ کھڑے ہوئے اور اپنے پیچھے پچاس اکابرین کی لاشیں چھوڑ گئے ــ جن میں خود ابوجہل بھی شامل تھا۔ مسلمانوں کے صرف چار آدمی کام آئے۔

فتح کی خوشی سے سرشار مسلمان قیدیوں کو پکڑنے اور اپنی تلواریں لہرانے لگے۔ قبائلی جنگ و جدل میں شکست خوردہ کے لیے کوئی جگہ نہ تھی۔ ہلاک شدگان کا مثلہ کیا جاتا اور قیدیوں کو مار ڈالا یا اذیتوں کا نشانہ بنایا جاتا۔ آنحضرتؐ نے اپنے سپاہیوں کو فوراً باز رہنے کا حکم دیا۔ ایک نئی وحی نے

اس امر کو یقینی بنایا کہ جنگی قیدی کو مار ڈالنا یا تاوان کے بدلے چھوڑ دینا چاہیے۔[15] مسلمانوں نے جنگ میں بھی ماضی کے وحشیانہ طور طریقوں سے اجتناب کیا۔

قرآن عفو و درگزر پر متواتر زور دیتا ہے، حتیٰ کہ مسلح لڑائی کے دوران بھی۔[16] دشمنیوں اور رقابتوں میں الجھے ہوئے مسلمانوں کے لیے بھی ہمت اور عزم صمیم کا مظاہرہ کرنا لازمی تھا تا کہ لڑائی کو جلد از جلد انجام تک پہنچا سکیں؛ لیکن جونہی کوئی دشمن امان مانگتا، مسلمان کے لیے اسے معاف کر دینا ضروری تھا۔[17] انہیں معاہدۂ جنگ بندی ہر حالت میں تسلیم کرنا تھا، چاہے شرائط کچھ بھی ہوں — حتیٰ کہ اس صورت میں بھی جب دشمن کی منافقت کا شبہ ہو۔ اگرچہ ظلم اور استحصال کے خلاف لڑنا اہم تھا، لیکن قرآن متواتر مسلمانوں کو یاد دلاتا رہا کہ مل بیٹھنا اور خوش اخلاق مذاکرات کے ذریعے مسئلہ سلجھانا بہتر ہے۔[18] درست کہ خدا نے توریت میں انتقام کی اجازت دی — آنکھ، دانت کے بدلے دانت — ''لیکن جو شخص بطور خیرات اسے درگزر کر دے وہ اپنے سابقہ گناہوں سے نجات پائے گا۔''[19] بدلہ صرف ان لوگوں تک محدود تھا جنہوں نے بالاصل دست درازی کی ہوتی — اصولِ انتقام میں ایک عظیم پیش رفت جو قاتل کے قبیلے کے کسی بھی رکن سے انتقام لینے کی اجازت دیتا تھا۔ قرآن نے مسلمانوں کو یاد دلایا کہ وہ پورے قریش قبیلے سے نہیں لڑ رہے؛ ساری لڑائی میں غیر جانب دار رہنے والے اور مکہ میں ہی ٹھہرنے کا انتخاب کرنے والے مسلمانوں پر کسی بھی صورت میں حملہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔[20]

حضرت محمدؐ امن کا پرچار نہیں کر رہے تھے۔ آپؐ کو یقین تھا کہ کبھی کبھی لڑائی ناگزیر اور حتیٰ کہ لازمی ہوتی ہے۔ جنگ بدر کے بعد مسلمانوں کو علم ہو گیا کہ مکہ جلد یا بدیر بدلہ ضرور لے گا۔ انہوں نے ایک طویل، گوریلہ بنیادوں پر ''جہاد'' کی تیاری شروع کر دی لیکن اس لفظ (جو ہم آج کل اکثر سنتے ہیں) کا بنیادی مطلب ''مقدس جنگ'' نہیں بلکہ ''کوشش'' یا ''جہد'' ہے — خدا کے حکم کو نافذ کرنے کے لیے لازمی کوشش۔ مسلمانوں کو یہ کوشش تمام شعبوں میں کرنے کی ترغیب دلائی جاتی ہے: عقلی، سماجی، معاشی، روحانی اور گھریلو۔ بدر سے واپس آتے ہوئے آنحضرتؐ نے ایک اہم اور اکثر بطور حوالہ استعمال ہونے والا جملہ ادا کیا: ''ہم جہادِ اصغر (لڑائی) سے جہادِ اکبر کی

جانب جا رہے ہیں۔'' یہ بڑا جہاد یا جہادِ اکبر اپنے معاشرے اور قلوب کی اصلاح کرنے کی اہم اور مشکل کوشش تھی۔

واقعہ بدر نے حضرت محمدؐ کو نخلستان میں پہلے کی نسبت کہیں زیادہ قدآور شخصیت بنا دیا۔ قریش کی جانب سے ناگزیر جوابی وار کی تیاری کرتے ہوئے حضرت محمدؐ اور مدینہ کے عرب و یہودی قبائل کے درمیان ایک معاہدہ طے پایا۔ یہودی مسلمانوں کے ساتھ پرامن طور پر رہنا چاہتے تھے، اور انہوں نے وعدہ کیا کہ مکہ کے ساتھ الگ سے کوئی معاہدہ نہیں کریں گے۔ تمام باشندوں کے لیے حملے کے خلاف مدافعت کرنا ضروری ٹھہرا۔ نئے دستور نے یہودی قبیلوں کی مذہبی آزادی کی ضمانت دی، لیکن توقع کی کہ ''اس دستاویز کے فریقین کے خلاف لڑنے والے کسی بھی شخص کی مدد کی جائے گی۔''[21] آنحضرتؐ جاننا چاہتے تھے کہ کون آپؐ کا طرف دار ہے۔ اس معاہدے کی شرائط قبول کرنے سے منکر لوگ نخلستان چھوڑ گئے۔ ان میں متعدد حنفی شامل تھے جن کی کعبہ سے عقیدت قریش کے ساتھ وفادار رہنے کی متقاضی تھی۔ حضرت محمدؐ ابھی تک ایک متنازع شخصیت تھے، لیکن بدر کے مقام پر آپؐ کی فتح کے نتیجے میں کچھ ایک بدو قبائل آئندہ لڑائی میں مدینہ کے حلیف بننے پر آمادہ تھے۔

حضرت محمدؐ کی گھریلو زندگی میں بھی تبدیلیاں آئیں۔ بدر سے واپسی پر آپؐ کو اپنی بیٹی رقیہؓ کی وفات کی خبر ملی۔ حضرت عثمانؓ شدید دکھی تھے لیکن اپنی مرحومہ بیوی کی بہن اُم کلثومؓ کا رشتہ قبول کرنے اور پیغمبر کے ساتھ قریبی تعلق قائم رہنے پر بہت خوش بھی ہوئے۔ جنگی قیدیوں میں حضرت محمدؐ کا داماد ابوالعاص بھی شامل تھا جو روایتی عقیدے پر قائم رہا۔ اس کی بیوی زینبؓ (جو مکہ میں ہی تھیں) نے حضرت خدیجہؓ سے ملے ہوئے ایک کنگن سمیت زرِ فدیہ مدینہ بھجوایا۔ حضرت محمدؐ نے کنگن فوراً پہچان لیا اور بہت رنجیدہ ہوئے۔ آپؐ نے فدیہ لیے بغیر ابوالعاص کو چھوڑ دیا اور امید کی کہ وہ اسلام کی طرف مائل ہو جائے گا۔ ابوالعاص نے اسلام قبول کرنے سے انکار کیا لیکن بڑے دکھ کے ساتھ حضرت محمدؐ کی یہ درخواست مان لی کہ وہ زینبؓ اور اپنی کمسن بیٹی عمامہؓ کو مدینہ بھجوا دے کیونکہ اب مکہ میں رہنا ناممکن ہو جائے گا۔ یہ آنحضرتؐ کی سب سے چھوٹی بیٹی حضرت فاطمہؓ کی شادی کا موقع بھی تھا۔ آپؐ نے ان کا ہاتھ حضرت علیؓ کو دیا۔ شوہر اور بیوی نے مسجد کے قریب گھر

میں اقامت اختیار کی۔

حضرت محمدؐ نے بھی ایک اور شادی کی: حضرت عمرؓ کی بیٹی حضرت حفصہؓ سے جو حال ہی میں بیوہ ہوئی تھیں۔ وہ بہت خوبصورت اور متمول تھیں، اور حضرت محمدؐ سے شادی کے وقت ان کی عمر 18 سال تھی۔ اپنے والد کی طرح وہ بھی لکھنے پڑھنے کے قابل تھیں، لیکن انہیں حضرت عمرؓ کی تیز مزاجی بھی ورثہ میں ملی تھی۔ حضرت عائشہؓ اس شادی پر کچھ خفا تھیں۔ عائشہ صدیقہؓ کو آپؐ کی دیگر بیویوں پر بھی اعتراض ہوا، لیکن اپنے باپوں کے درمیان بڑھتے ہوئے بندھن نے ان دونوں لڑکیوں کو قریبی دوست بنا دیا۔ دونوں نے مل کر حضرت سودہؓ کا بھرپور مقابلہ کیا۔

اس وقت تک حضرت عائشہؓ مسجد میں اپنے لیے تیار کیے گئے حجرے میں منتقل ہو چکی ہوں گی، البتہ طبری کہتا ہے کہ کمسنی کی بنا پر انہیں مزید کچھ عرصہ والدین کے پاس ہی رہنے دیا گیا۔ حضرت محمدؐ محبت کرنے والے شوہر تھے۔ آپؐ نے اپنی بیویوں سے اصرار کیا کہ اپنے چھوٹے چھوٹے حجروں میں ہی رہیں، لیکن ہمیشہ گھر کے کام کاج میں ان کا ہاتھ بٹایا اور اپنی ضرورتوں کا خود خیال رکھا۔ آپؐ اپنے کپڑوں پر خود پیوند لگاتے، جوتے خود گانٹھتے اور گھر کی بکریوں کا خیال بھی رکھتے۔ حضرت عائشہؓ کے ساتھ آپؐ کے تعلقات بالخصوص پر محبت تھے۔ آپؓ تیز گو اور نسبتاً لاڈلی زوجہ تھیں، لیکن آپ کو شوہرؐ کی خدمت کرنا بھی پسند تھا۔ وہ آپؐ کے بالوں میں تیل لگاتیں اور ایک ہی پیالے سے پیتیں۔ ایک روز آپؐ اہلِ خانہ کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے اپنے جوتے گانٹھنے میں مصروف تھے کہ حضرت عائشہؓ نے آپ کے چہرے کو ایک دم منور ہوتے دیکھا۔ حضرت عائشہؓ نے آپؐ کے روشن اور مسرور چہرے کی تعریف کی تو آپؐ اٹھے اور انہیں پیشانی پہ بوسہ دیتے ہوئے کہا، ''اے عائشہ، اللہ تمہیں جزا دے گا۔ میں تمہارے لیے اُتنا باعث مسرت نہیں جتنی تم میرے لیے ہو۔''[22]

آنحضرتؐ نے اپنے اہلِ خانہ اور صحابہ کرامؓ کے ساتھ قریبی تعلق رکھا اور اپنی عوامی و نجی زندگی کے درمیان کوئی تضاد نہ خیال کیا۔[23] آپؐ کی ازواج مطہرات مسجد میں ہونے والی ہر گفتگو سن سکتی تھیں۔ مہاجرین نے فوری غور کیا کہ مدینہ کی عورتیں مختلف اور نسبتاً بے قابو تھیں اور انہوں نے جلد ہی دیکھا کہ ان کی اپنی بیویاں بھی مدنی عورتوں کے آزادانہ طور طریقے اپنانے لگی تھیں۔

حضرت عمرؓ اس وقت بہت غصے میں آئے جب ان کی زوجہ نے چپ چاپ ہر بات ماننے کی بجائے جواب دینا شروع کر دیے۔ اور سرزنش کیے جانے پر اس نے جواب دیا کہ آنحضرت بھی اپنی بیویوں کو کھل کر بحث کرنے کی اجازت دیتے ہیں۔[24] مسئلہ بگڑ رہا تھا۔ حضرت محمدؐ کے ہاں نجی اور عوامی زندگی کا امتزاج مردانہ بالادستی پر ایک کاری وار تھا۔ اس بالادستی کو قائم رکھنے کے لیے امتیاز برقرار رکھنا ضروری تھا۔

فتح کا جوش وخروش ماند پڑنے پر آنحضرتؐ نے یہ بھی دیکھا کہ عرب میں آپؐ کا وقار بڑھ گیا تھا۔ اہلِ مکہ کی جانب سے جوابی حملے کا واضح خطرہ مدینہ میں مخالف پارٹی کو مشتعل کر رہا تھا۔ ابن ابیعہ اور اس کے حامیوں کو یہودیوں کے تین سب سے بڑے قبائل ـــ نفیر، قریظہ اور قینقاع ـــ کی حمایت حاصل تھی جن کا دارومدار قریش کے ساتھ تجارتی تعلقات پر تھا اور جو مکہ کے خلاف کسی بھی جنگ میں کوئی حصہ نہیں لینا چاہتے تھے۔ نخلستان میں ایک تیسرا دھڑا بھی ابھر رہا تھا۔ واقعہ بدر کے کوئی دس ہفتے بعد ابوسفیان دوسو آدمیوں کا ایک برائے نام دستہ لے کر مدینہ سے باہر کھیتوں میں گیا اور رات کے اندھیرے سے فائدہ اٹھا کر نفیر کے علاقے میں جا پہنچا جہاں سردار سلام ابن مِشکان نے اس کی خاطر مدارت کی۔ ابن اسحٰق کے مطابق اس نے ابوسفیان کو "مسلمانوں کے متعلق خفیہ معلومات فراہم کیں۔"[25]

حضرت محمدؐ کے پیروکاروں نے آپؐ کو صورت حالات سے متواتر باخبر رکھا۔ یہ تین یہودی قبیلے واضح طور پر سلامتی کے لیے خطرہ تھے۔ ان کے پاس وسیع افواج اور تربیت یافتہ سپاہی موجود تھے۔ اگر کوئی مکی فوج مدینہ کے جنوب میں خیمہ زن ہو جاتی، جہاں نفیر اور قریظہ کے علاقے تھے، تو وہ بہ آسانی متحد ہو کر شہر کے دفاع کے لیے کیے ہوئے معاہدے توڑ ڈالتے۔ اگر قریش شمال کی طرف سے حملے کا فیصلہ کرتے (جو ان کے لیے بہترین تھا) تو نفیر اور قریظہ جنوب سے مسلمانوں پر چڑھائی کر سکتے تھے۔ لیکن سب سے زیادہ پریشان بنوقینقاع کی تھی ـــ یہودی قبائل میں سے امیر ترین اور ابن ابیعہ کے سابق حلیف جو مدینہ کے قلب میں منڈی کے مختار تھے۔[26] مسلمانوں نے اپنی ایک چھوٹی سی مارکیٹ بھی بنالی تھی اور مذہبی وجوہ کی بنا پر سود نہیں لیتے تھے۔ اسے ایک

براہ راست چیلنج سمجھتے ہوئے قینقاع نے آنحضرتؐ کے ساتھ معاہدہ توڑنے اور مخالفین کے ساتھ اتحاد بنانے کا فیصلہ کیا۔ آپؐ ان کے علاقے میں گئے اور دین ابراہیمؑ کے نام پر ان سے امن قائم رکھنے کو کہا۔ انہوں نے باغیانہ خاموشی کے ساتھ آپؐ کی بات سنی اور پھر جواب دیا:

> اے محمدؐ، لگتا ہے کہ تم ہمیں اپنی امت میں شامل سمجھتے ہو۔ خود کو دھوکے میں نہ رکھو، کیونکہ (بدر میں) تمہارا مقابلہ ایک ایسے قبیلے سے ہوا جو فنِ حرب نہیں جانتا تھا اور تمہارا پلہ بھاری رہا؛ اللہ کی قسم، اگر ہمارے ساتھ تمہاری لڑائی ہوئی تو تم ہمیں حقیقی مرد پاؤ گے![27]

آنحضرتؐ واپس آ گئے اور نئی صورت حال کا انتظار کرنے لگے۔

چند روز بعد قینقاع کی منڈی میں اس وقت ایک تنازع کھڑا ہو گیا جب یہودی سناروں نے ایک مسلمان عورت کی بے عزتی کی۔ حکم کی حیثیت میں آنحضرتؐ کو ثالثی کے لیے بلایا گیا، لیکن قینقاع کے سرداروں نے آپؐ کا فیصلہ ماننے سے انکار کرتے ہوئے خود کو اپنے قلعے میں بند کر لیا اور عرب حلیفوں کو مدد کے لیے بلایا۔ قینقاع کے پاس 700 افراد پر مشتمل فوج تھی، اور اگر ان کے حلیف بھی آ جاتے تو یقیناً امت کو شکست اور تباہی سے دوچار ہونا پڑتا۔ لیکن عرب بدستور آنحضرتؐ کی حمایت پر ڈٹے رہے اور ابن ابیہ نے اپنے پرانے اتحادیوں کی مدد کرنے میں خود کو لاچار پایا۔ دو ہفتے طویل محاصرے کے بعد قینقاع کو غیر مشروط طور پر ہتھیار پھینکنا پڑے۔ آنحضرتؐ سے امید تھی کہ آپؐ مردوں کو تہِ تیغ کر دیں گے اور عورتوں و بچوں کو بطور غلام بیچ دیں گے — غداروں کے لیے روایتی سزا — لیکن آپؐ نے ابن ابیہ کی درخواست منظور کرتے ہوئے انہیں اس شرط پر چھوڑ دیا کہ سارا قبیلہ فوراً مدینہ سے چلا جائے۔ قینقاع جانے کو تیار تھے۔ انہوں نے ایک جوا کھیلا تھا، لیکن آنحضرتؐ کی مقبولیت کا درست اندازہ نہ لگا پائے۔ ان کے عرب حلیفوں اور نہ ہی دیگر یہودیوں نے احتجاج کیا۔ ہجرت سے قبل اندرونی جنگوں کے دوران قبائل کو اکثر نخلستان سے بے دخل کیا جاتا تھا، لیکن یہ اخراج اس سلسلے کی کڑی تھا جو آنحضرتؐ کی آمد سے بہت پہلے شروع ہوا۔[28] خوں ریزی سے اجتناب کیا گیا، لیکن مسلمان ایک المناک اخلاقی الجھن

سے دوچار ہوئے: قریش کے خلاف جہاد کا جواز مسلمانوں کو ان کے آبائی شہر سے نکالا جانا تھا جسے قرآن نے ایک عظیم برائی قرار دیا۔ اب عرب کے جارحیت پسندانہ دساتیر میں پھنسے ہوئے مسلمان ایک اور قبیلے کو ان کے وطن سے نکالنے پر مجبور ہوئے۔

اہلِ مدینہ اہلِ مکہ کی جانب سے ناگزیر حملے کے منتظر تھے۔ چونکہ معرکہ بدر میں ابوجہل مارا گیا اور کچھ ہی عرصہ بعد ابولہب بھی مر گیا، اس لیے اب ابوسفیان قریش کا سردار اور ان کی نسبت کہیں زیادہ سخت دشمن تھا۔ موسم گرما کے آخر میں مسلمان غازیوں کے ایک دستے نے ایک مکی تجارتی قافلے کو قبضے میں لے لیا۔ اگر ابوجہل زندہ ہوتا تو ضرور فوری جوابی کارروائی کرتا، لیکن ابوسفیان نے اس شکست کو اپنے طویل المیعاد مقاصد کی راہ میں رکاوٹ نہ بننے دیا۔ اس نے اپنی تیاریوں میں شدت پیدا کی، بدوی حلیفوں کا ایک وسیع اتحاد بنایا۔ موسمِ سرما کی بارشیں ختم ہونے پر 11 مارچ 625ء کو تین ہزار آدمی تین ہزار اونٹوں اور دو ہزار گھوڑوں کے ہمراہ مکہ سے روانہ ہوئے اور شمال کی جانب سفر شروع کیا۔ کوئی ایک ہفتہ سفر کے بعد انہوں نے مدینہ کے شمال مغرب میں کوہِ احد کے بالمقابل اپنے خیمے لگائے۔[29]

اہلِ مدینہ کو صرف ایک ہفتہ پہلے مکیوں کی پیش قدمی کی اطلاع ملی۔ کھیتوں سے فصل اکٹھی کرنے کی مہلت نہیں تھی، لیکن آنحضرتؐ اور دیگر قبائلی سردار بیرونی علاقوں سے لوگوں کو لا کر "شہر" میں مورچہ بند کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ تجربہ کار جنگجوؤں نے احتیاط پر زور دیا۔ عرب میں محاصرے کا مقابلہ کرنا بہت مشکل تھا؛ اور انہوں نے مشورہ دیا کہ ہر شخص مورچوں کے پیچھے رہے اور قریش کے ساتھ براہِ راست جنگ کرنے کی بجائے انتظار کرے یہاں تک کہ وہ واپسی پر مجبور ہو جائیں۔ لیکن بدر میں فتح کے بعد مدنی نوجوان جوہر دکھانا اور فتح حاصل کرنا چاہتے تھے۔ آنحضرتؐ (جو سپہ سالار نہیں تھے) کو اس تباہ کن فیصلے پر مجبور ہونا پڑا۔ مرکزی یہودی قبیلوں نے لڑنے سے انکار کر دیا اور ابن ابیہ اپنے آدمیوں کو فوج میں سے نکال کر لے گیا، چنانچہ اگلے روز آنحضرتؐ کی فوج قریش کے مقابلے میں صرف ایک تہائی تھی۔ جب دونوں افواج نے پیش قدمی شروع کی تو ابوسفیان کی بیوی ہند دیگر عورتوں کے ہمراہ اہلِ مکہ کے پیچھے پیچھے جنگی گیت گاتی ہوئی طنبورے بجانے میں مشغول تھی۔ مکی گھوڑ سواروں کے زبردست حملے نے تقریباً فوراً ہی مسلمانوں کو

پسپائی پر مجبور کر دیا۔ حضرت محمدؐ کے دندانِ مبارک بھی اس لڑائی کے دوران شہید ہوئے اور آپؐ کی شہادت کی افواہ اڑی۔

درحقیقت، آپؐ زخمی ہو گئے تھے، لیکن قریش نے افواہ کی تصدیق کی اور اپنی حاصل کردہ برتری سے خاطر خواہ فائدہ نہ اٹھا سکے۔ لہٰذا زندہ بچ جانے والے مسلمان کافی منظم انداز میں پسپائی اختیار کرنے کے قابل تھے۔ 22 مکی اور 65 مسلمان کام آئے جن میں آنحضرتؐ کے چچا حضرت حمزہؓ بھی شامل تھے۔ قریش میدان جنگ پر چڑھ دوڑے اور لاشوں کا مثلہ کیا؛ ایک نے حضرت حمزہؓ کا کلیجہ نکال کر ہند کو پیش کیا جس نے اپنے بھائی کا انتقام لینے کی خاطر اسے دانتوں سے چبایا۔ تب اس نے حضرت حمزہؓ کا ناک، کان اور عضو تناسل کاٹے اور دوسری عورتوں کو بھی ایسا ہی کرنے کا کہا۔ کچھ بدو حلیف اس حرکت کو ناپسند کرتے ہوئے میدانِ جنگ سے چلے گئے۔ ابھی ابوسفیان کی فوج نے کوچ نہیں کیا تھا کہ اسے یہ مایوس کن خبر ملی کہ مسلمان شہدأ میں آنحضرتؐ شامل نہیں۔ وہ دعوتِ مبارزت دیتے ہوئے چلایا: ''اگلے سال بدر کے مقام پر۔'' ایک مسلمان نے حضرت محمدؐ کے ایماء پر جواب دیا ''ہاں! یہ ہمارا اور تمہارا عہد ہے!''[30]

مسلمانوں کی شکست اور بھی زیادہ خوفناک ہو سکتی تھی۔ اگر قریش مفرور فوج کا تعاقب کرتے تو شاید ساری امت کا خاتمہ کر ڈالتے۔ لیکن اُحد کا نفسیاتی اثر نہایت گہرا تھا۔ لڑائی کے بعد جب آنحضرتؐ گھر واپس آئے تو مسجد کے باہر گریہ وزاری کی آوازیں سنیں: انصار کی عورتیں اپنے مرنے والوں کا گریہ کر رہی تھیں۔ ابن ابیعہ کی جانب سے لڑنے سے انکار پر مسلمانوں کو شدید غصہ آیا۔ اگلے جمعہ کے روز جب وہ مسجد میں خطاب کرنے کھڑا ہوا تو انصار میں سے ایک شخص نے اسے ایک طرف گھسیٹا اور خاموش رہنے کو کہا۔ وہ غیض و غضب کے عالم میں مسجد سے نکلا اور آنحضرتؐ سے معافی مانگنے سے انکار کر دیا۔ تب کے بعد منافقین (ابن ابیعہ کے پیروکاروں کے لیے قرآن کی اصطلاح) پل پل اپنی وفاداریاں بدلتے اور حالات واضح ہونے کا انتظار کرتے رہے تھے۔ اب وہ کھلی مخالفت پر اتر آئے۔ انہوں نے دعویٰ کیا کہ بدر کے مقام پر آپ کی فتح محض اتفاقی تھی، آپؐ مدینہ پر موت اور تباہی لائے تھے۔ ہر شہید ہونے والے مسلمان کی بیویاں اور بیٹیاں بے سہارا ہو گئی تھیں۔ شکست کے بعد آپؐ کو ایک وحی میں چار بیویاں رکھنے کی اجازت

دی گئی۔ مسلمانوں کے لیے یہ یاد رکھنا لازمی ہے کہ اللہ نے مردوں اور عورتوں کو ایک ہی زندہ وجود سے تخلیق کیا، لہٰذا دونوں اصناف اس کی نظر میں برابر ہیں:

> یتیموں کو ان کی املاک دو اور (اپنی) بری چیزوں کا تبادلہ (ان کی) اچھی چیزوں کے ساتھ نہ کرو، اور ان کی املاک کو اپنی املاک میں نہ کھپاؤ۔ یہ بلاشبہ ایک کبیرہ گناہ ہے۔
>
> اور اگر تمہیں خوف ہے کہ تم یتیموں کے ساتھ منصفانہ سلوک نہیں کر سکتے تو دوسری عورتوں سے شادی کر لو جو تمہارے لیے جائز ہیں ـــ (حتیٰ کہ) دو دو یا تین تین یا چار چار: لیکن اگر خوف ہے کہ ان کے درمیان انصاف نہیں کر سکو گے تو ایک ہی بیوی رکھو...... اس طرح تمہارا درست راہ سے منحرف نہ ہونا زیادہ ممکن ہو جائے گا۔[31]

کثیر الازدواجی کو مسلمان عورتوں کے لیے وجہ تکلیف ہونے کی بنیاد پر کافی تنقید کا نشانہ بنایا جاتا ہے، لیکن یہ آیت نازل ہونے کے وقت کثیر الازدواجی ایک سماجی بہتری کا اقدام تھا۔[32] قبل از اسلام عہد میں مرد اور عورتیں دونوں ہی ایک سے زائد شریکِ حیات رکھا کرتے تھے۔ شادی کے بعد عورت اپنے خاندانی گھر میں ہی رہتی اور اپنے ''شوہروں'' کے پاس رہنے جایا کرتی تھی۔ دراصل یہ ایک قسم کی لائسنس یافتہ جسم فروشی تھی۔ چنانچہ پدریت غیر یقینی تھی اور بچوں کو عموماً ان کی ماؤں کے حوالے سے جانا جاتا تھا۔ مردوں کے لیے اپنی بیویوں کی کفالت کرنا لازمی نہ تھا، اور نہ وہ اپنی اولاد کی کوئی ذمہ داری لیتے تھے۔ لیکن عرب عبور کی حالت میں تھا۔ جزیرہ نما میں انفرادیت کے نئے جذبے کا مطلب تھا کہ مرد اپنے بچوں میں مزید دلچسپی لینے لگے تھے، وہ نجی جائیداد کے معاملے میں زیادہ حق جتاتے اور جائیداد اپنے بیٹوں کے نام منتقل کرنا چاہتے تھے۔ قرآن نے زیادہ پدرسری معاشرے کی جانب اس رجحان کی حوصلہ افزائی کی۔ حضرت محمدؐ نے اپنی بیویوں کو گھر میں ساتھ رکھا اور ان کی کفالت کی۔ اور کثیر الازدواجی کی تشکیل کرنے والی آیات نے

مسلمان مردوں سے بھی ایسا ہی کرنے کی توقع رکھی۔ لیکن قرآن ایک سماجی مسئلے سے بھی آگاہ تھا جسے اس نئی وحی میں حل کرنے کی کوشش کی گئی۔

قبل از اسلام دور میں عورت جائیداد نہیں رکھ سکتی تھی۔ اسے ملنے والی ساری دولت گھرانے کی ملکیت ہوتی اور مرد رشتہ دار ہی اس کا انتظام چلایا کرتے تھے۔ لیکن مکہ میں، جہاں انفرادیت پسندی عرب کے کسی بھی اور علاقہ کی نسبت زیادہ واشگاف تھی، کچھ ارسٹوکریٹک عورتیں اپنی جائیداد ترکہ میں چھوڑنے اور ان کا انتظام خود کرنے کے قابل ہوئی تھیں۔ حضرت خدیجہؓ کی مثال سب کے سامنے ہے۔ لیکن مکہ میں یہ چیز بہت کمیاب اور مدینہ میں تقریباً نامعلوم تھی۔ بیش تر مردوں نے عورتوں کے مالکِ جائیداد ہونے کا خیال قطعی حقارت انگیز پایا۔ عورتوں کو کوئی انفرادی حقوق حاصل نہ تھے۔ انہیں یہ حقوق کیسے مل سکتے تھے؟ چند قابلِ ذکر مستثنیات کو چھوڑ کر، وہ معیشت میں کوئی حصہ نہیں رکھتی تھیں؛ اور غزو میں حصہ نہ لینے کے باعث وہ امت کی دولت میں اضافے میں بھی شراکت دار نہ تھیں۔ روایتی طور پر عورتوں کو مردوں کی جاگیر میں شامل خیال کیا جاتا تھا۔ مرد کی موت پر اس کی بیویاں اور بیٹیاں مرد وارث کو مل جاتیں جو عموماً انہیں غیر شادی شدہ اور مفلوک الحال ہی رکھتا تاکہ ان کی جائیداد قبضے میں کر سکے۔

قرآن کا کثرتِ ازدواج کو منظوری دینا ایک سماجی قانون سازی کے عمل کا حصہ تھا۔ اس کا مقصد مردانہ جنسی اشتہا کی تسکین نہیں بلکہ بیواؤں، یتیموں اور دیگر لاچار عورتوں کے ساتھ ہونے والی ناانصافیوں کا ازالہ کرنا تھا۔ عام طور پر طاقتور افراد ہر چیز پر قبضہ کر لیتے اور خاندان کے نسبتاً کمزور اراکین کو محروم رکھتے۔[33] اکثر مرد سرپرست انہیں جنسی بدسلوکی کا نشانہ بناتے یا بطور غلام فروخت کر کے منافع کماتے تھے مثلاً ابن ابیہ نے اپنی کنیزوں/لونڈیوں کو جسم فروشی پر مجبور کیا اور آمدنی کو جیب میں ڈالا۔

قرآن واضح الفاظ میں اس طرزِ عمل کو مسترد کرتا اور جائیداد پر عورت کے حق کو جائز قرار دیتا ہے۔ کثرتِ ازدواج کا مقصد اس امر کو یقینی بنانا تھا کہ بے یار و مددگار عورتوں کی مہذب انداز میں شادی ہو اور پرانے، آزادانہ اور غیر ذمہ دارانہ معاشقوں کا خاتمہ ہو؛ مرد صرف چار بیویاں رکھنے اور ان کے ساتھ مساوی سلوک کرنے کے پابند تھے۔ ان کی جائیداد ہڑپ کرنا مکروہ فعل قرار پایا۔

قرآن عورتوں کو ایک قانونی رتبہ دلانے کی کوشش کر رہا تھا جو بیشتر مغربی خواتین کو انیسویں صدی تک بھی حاصل نہ ہو سکا۔ آزادئ نسواں کا منصوبہ آنحضرتؐ کے لیے نہایت مرغوب تھا، لیکن امت میں بہت سے لوگوں نے اس کی شدید مخالفت کی۔ بشمول کچھ قریبی صحابہؓ کرام کے۔ احتیاج کے شکار معاشرے میں چار عورتوں اور ان کے بچوں کے لیے مالی ذمہ داری اٹھانا ہمت اور ہمدردی کا متقاضی تھا۔ مسلمانوں کو یقین ہونا لازمی تھا کہ اللہ مدد کرے گا:

> اور تمہارے درمیان جو بیوائیں ہیں ان کی بھی شادیاں کراؤ اور اسی طرح جو تمہارے غلاموں اور لونڈیوں میں سے نیک چلن ہوں ان کی بھی شادی کراؤ۔ اگر وہ غریب ہوں تو اللہ اپنے فضل سے انہیں غنی بنا دے گا، اور اللہ بہت عطا کرنے والا اور دائمی علم رکھنے والا ہے۔[34]

آنحضرتؐ نے راہ دکھائی۔ اُحد کے بعد آپؐ نے ایک بیوہ حضرت زینبؓ بنت خزیمہ (جن کا شوہر بدر میں فوت ہوا تھا) کو گھر فراہم کیا۔ وہ بدوی قبیلے بنو عامر کے سردار کی بیٹی بھی تھیں؛ چنانچہ اس رشتے نے ایک نیا سیاسی اتحاد تشکیل دیا۔ مسجد کے پہلو میں حضرت زینبؓ کے لیے ایک حجرہ تعمیر کیا گیا اور وہ اپنی بہنوں — حضرت سودہؓ، حضرت عائشہؓ اور حضرت حفصہؓ — کے ساتھ وہاں رہنے لگیں۔

حضرت محمدؐ نے اپنی عورتوں کے ساتھ جائیداد جیسا سلوک نہ کیا۔ مردوں کی طرح وہ بھی آپؐ کی ''صحابہ'' تھیں۔ عموماً آپؐ عسکری مہم میں بھی ان میں سے کسی کو ساتھ لے کر جاتے اور ہر شام سارا وقت اپنے خیمے میں ہی گزار کر بہت سے سپہ سالاروں کو مایوس کیا۔ پڑاؤ میں عورتیں پردہ نشین بیٹھی رہنے کی بجائے آزادانہ اِدھر اُدھر گھومتی پھرتی، ہر کارروائی میں دلچسپی لیتی تھیں۔ قبل از اسلام عرب میں عورتوں کے لیے اس قسم کی آزادی عام تھی، لیکن حضرت عمرؓ نے اسے ناپسند کیا۔ ایک روز انہوں نے حضرت عائشہؓ کو اگلی صفوں کے قریب چہل قدمی کرتے دیکھ کر ڈانٹا: ''تمہاری بے باکی گستاخی کی حد تک پہنچ گئی ہے۔ اگر کوئی حادثہ پیش آ گیا تو کیا ہوگا؟ اگر شکست ہوئی اور

لوگوں کو قیدی بنالیا گیا تو.....؟"[35] آنحضرتؐ کے گھریلو انتظام نے آپؐ کی ازدواج کو سیاست کے میدان تک ایک نئی رسائی فراہم کی اور وہ اس میدان میں کافی تاک دکھائی دیتی تھیں۔ کچھ ہی عرصہ بعد دیگر عورتیں بھی یہ اختیار استعمال کرنے لگیں اور دشمن عورتوں کی اس آزادی کی بنیاد پر آنحضرتؐ کو تنقید کا نشانہ بنانے لگے۔

آنحضرتؐ کو اُحد میں کھوئی ہوئی عظمت اور وقار بحال کرنا تھا۔ آپؐ قریش کے ساتھ ایک اور لڑائی کا خطرہ مول نہیں لے سکتے تھے، لیکن اپنی کمزوری بھی ظاہر نہیں کرنا چاہتے تھے۔ 625ء کے موسمِ گرما میں دو واقعات نے آپؐ کی نازک صورت حال عیاں کردی۔ مدینہ کے مغرب میں نجد نامی خطے کے دو بدو قبائل نے اسلام کے بارے میں جاننے کی خواہش ظاہر کی، چنانچہ آپؐ نے اپنے چھ قابل ترین ساتھیوں کو بھیجا۔ سفر کے دوران ان پر قضید/Qudayd (دیوی منات کا شہر) کے ایک سردار نے حملہ کردیا۔ تین مسلمان مارے گئے اور باقیوں کو قیدی بنالیا گیا۔ ایک نے فرار ہونے کی کوشش کی تو اسے سنگسار اور باقی دو کو مکہ میں فروخت کردیا گیا۔ بعد ازاں اِن دونوں کو معبد کے باہر لے جاکر صلیب دی گئی۔

تقریباً انہی دنوں میں آنحضرتؐ کے نئے سسر، بنو عامر کے سردار ابو براٗ نے اپنے قبیلے کے متحارب دھڑوں کے خلاف مدد مانگی۔ چالیس مسلمان روانہ کیے گئے اور تقریباً سبھی بنو عامر کے علاقے کی حد کے قریب قتل ہوئے۔ سلیم قبیلے کے لوگوں نے انہیں تہِ تیغ کیا۔ جب زندہ بچنے والے مسلمانوں میں سے ایک نے دو عامری سرداروں کو درخت تلے محوِ آرام دیکھا تو انہیں قتل کر کے روایتی انداز میں بدلہ لیا۔ جب وہ واپس مدینہ آیا تو آنحضرتؐ نے فرمایا کہ اس نے غلط کیا ہے۔ لیکن قصاص کی روایت عرب میں اس قدر گہرائی تک سرایت کیے ہوئے تھی کہ اسے ختم کرنا تقریباً ناممکن تھا۔ آپؐ نے معمول کے مطابق ابو براٗ کو معاوضہ کی پیشکش کی۔ اگرچہ آپؐ جانتے تھے کہ تکنیکی اعتبار سے یہ جرم سلیم قبیلے والوں کا بنتا تھا مگر آپؐ معاوضہ دینے پر تیار تھے۔ اس بات نے کچھ بدوؤں کے دل میں امت کی جانب رغبت پیدا کردی۔ کچھ سُلیمی اس قدر متاثر ہوئے کہ اسلام قبول کرلیا۔

تاہم، مدینہ میں مسلمانوں کی حالت بدستور پتلی رہی، اور آنحضرتؐ اپنے محافظین کو الگ

کرنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتے تھے۔ جب آپؐ نے یہودی قبیلے بنونضیر کو عامر کے لیے قصاص کی رقم جمع کرنے کو کہا تو ایک قاتلانہ حملے میں بال بال بچے: بنونضیر کے کچھ افراد نے ایک قریبی مکان کی چھت سے آپؐ پر بہت بڑا پتھر گرانے کا منصوبہ بنایا تھا۔ ابن ابیعہ نے ان لوگوں کی مدد کا وعدہ کیا تھا اور غالباً انہوں نے سوچ لیا کہ اُحد کے بعد آنحضرتؐ اس قدر غیر مقبول ہو گئے تھے کہ اہلِ مدینہ ان کے پیچھے نہیں نکلیں گے۔ چنانچہ وہ اپنے سابقہ حلیف کی جانب سے ایک سنگین پیغام ملنے پر ششدر رہ گئے۔ قبیلہ اوس نے کہا کہ انہوں نے حضرت محمدؐ کے ساتھ معاہدے کی خلاف ورزی کی ہے اور اب وہ اس شہر میں نہیں رہ سکتے۔

اپنے سے پہلے بنوقینقاع کی طرح بنونضیر بھی قلعے میں بند ہو گئے اور اپنے حلیفوں کی جانب سے معافی ملنے کا انتظار کرنے لگے لیکن اس مرتبہ بھی مدد نہ آئی۔ حتیٰ کہ طاقتور یہودی قبیلے بنوقریظہ (جو آپؐ کے دشمن تھے) نے انہیں بتا دیا کہ وہ صرف اپنے اوپر ہی بھروسہ کریں۔ دو ہفتے بعد بنونضیر کو معلوم ہو گیا کہ اب وہ مزید محصور نہیں رہ سکتے اور جب آنحضرتؐ نے ان کے کھجور کے درخت کاٹ ڈالنے کا حکم دیا — عرب میں اعلانِ جنگ کی علامت — تو انہوں نے ہتھیار ڈال دیے اور جانوں کی سلامتی چاہی۔ حضرت محمدؐ نے اس شرط پر انہیں معاف کر دیا کہ وہ فوراً نخلستان سے چلے جائیں اور جتنا مال اسباب اونٹوں پہ لاد سکتے ہیں، ساتھ لے جائیں۔ لہٰذا بنونضیر نے اپنا اسباب باندھا اور اپنے گھروں کے شہتیر (Lintels) تک اتار کر لے گئے۔ انہوں نے ایک فخر مند جلوس کی صورت میں مدینہ کو خیر باد کہا، کہ جیسے فتح پا کر آئے ہوں۔ ان کی عورتیں زیور اور عمدہ لباس سے آراستہ ہو کر طنبوروں اور نفیریوں کی دُھن پر گیت گا رہی تھیں۔ باغات اور نخلستان کی بستیوں سے گزرتے ہوئے انہوں نے شام کی راہ لی؛ البتہ کچھ ایک نے قریبی یہودی بستی خیبر میں اقامت اختیار کی اور شمالی قبائل کو متحد کر کے ابوسفیان کو مسلمانوں کے خلاف کنفیڈریسی بنانے میں مدد دی۔[36]

دو سال کے مختصر عرصے میں حضرت محمدؐ نے دو طاقتور قبیلوں کو مدینہ سے نکال دیا تھا۔ اب قینقاع کی چھوڑی ہوئی مارکیٹ مسلمان چلانے لگے۔ جیسا کہ ہم نے دیکھا، آپؐ کا مقصد یہ نہیں تھا۔ آپؐ تشدد اور بے دخلی کا سلسلہ جاری رکھنے کی بجائے ختم کرنا چاہتے تھے۔ آپؐ نے ثابت کر

دیا تھا کہ آپ اب بھی درخورِ اعتنا ہیں، لیکن آپ نے اس قسم کی کامیابی کی اخلاقی اور سیاسی لا حاصلیت پر بھی غور و فکر کیا ہوگا، کیونکہ بنونضیر قریبی خیبر میں بدستور ایک خطرہ بن کر منڈلاتے رہے۔

اب جنگِ اُحد کے بعد ابوسفیان کی لگائی ہوئی پکار کا جواب دینے کا وقت آ گیا تھا: ''اگلے سال بدر میں!'' لیکن مسلمان ایک نہایت خطرناک کھیل کھیل رہے تھے۔ آپ کو طاقت کا مظاہرہ کرنا تھا، لیکن فوج اس قدر بے جوش تھی کہ لڑائی مول نہیں لی جا سکتی تھی۔ بایں ہمہ، بدر کے سالانہ میلے سوق کے ہفتے کے دوران آپ 1,500 آدمیوں کو ساتھ لے کر وہاں گئے۔ خوش قسمتی سے ابوسفیان وہاں نہ آیا۔ اسے توقع نہیں تھی کہ مسلمان اس کا چیلنج قبول کریں گے اور وہ محض ایک نمائشی فوج لے کر روانہ ہوا تھا۔ جونہی اس نے آپ کے مدینہ سے روانہ ہونے کا سنا تو واپس پلٹنے کی تیاری کرنے لگا۔ یہ شدید خشک سال تھا اور سفر کے دوران اونٹوں کو کھلانے کے لیے کوئی گھاس موجود نہ تھی۔ لہٰذا صرف چند روز کی رسد ساتھ ہونے کے باعث ابوسفیان کو واپس جانا پڑا۔ اہلِ مکہ نے اسے بہت برا بھلا کہا کیونکہ بدو مسلمانوں کی بہادری کو تحسین کی نظر سے دیکھتے تھے۔[37]

مدینہ میں آپ کی حیثیت ابھی تک غیر مستحکم تھی۔[38] لیکن مجموعی طور پر جزیرہ نما میں حالات کا دھارا آپ کی حمایت میں بہنے لگا۔ جب بھی آپ کو خبر ملتی کہ کوئی بدو قبیلہ مسلمان اتحاد میں شامل ہوگیا ہے تو آپ ایک غزو کی قیادت کرتے ہوئے اس کے ریوڑ قبضہ میں لے لیتے؛ چاہے اس کی خاطر 500 میل کا سفر کر کے شامی سرحد تک ہی کیوں نہ جانا پڑتا۔ جون 626ء میں آپ کو پتا چلا کہ بنوغطفان کے کچھ قبیلے مدینہ پر فوج کشی کا سوچ رہے ہیں تو ان کی سرکوبی کرنے نکل کھڑے ہوئے۔ جب مسلمان ذات الرقاع میں دشمن سے دو بدو ہوئے تو آپ نے ایک مرتبہ پھر براہِ راست لڑائی سے گریز کیا۔ لیکن مسلمان تین روز تک دشمن کے سامنے خیمہ زن رہے۔ طبری اور ابن اسحٰق دونوں نے واضح الفاظ میں کہا ہے کہ مسلمان سپاہی خوف زدہ تھے، لیکن لگتا ہے کہ بنو غطفان بھی ڈر رہے تھے۔ دہشت کی اس فضا میں آنحضرتؐ پر ایک وحی نازل ہوئی جس نے ''نماز خوف'' کی صورت اختیار کی—ہنگامی عسکری صورت حال کے پیشِ نظر نماز کی ایک اختصار شدہ صورت۔[39] مقرر اوقات پر باجماعت نماز ادا کرنے کی صورت میں دشمن کی جانب سے خطرہ تھا، لہٰذا مسلمانوں نے مسلح ہو کر مختصر عبادت پر اکتفا کی۔ انجام کار لڑائی ہوتے ہوتے رہ گئی؛ بنو

غطفان واپس چلے گئے اور آنحضرتؐ نے مدینہ کی راہ لی۔ آپؐ نے علامتی فتح حاصل کر لی تھی۔

نمازِ خوف سے اندازہ ہوتا ہے کہ نیا مذہب کس حد تک دفاعی حکمت عملی اپنا چکا تھا۔ حنفی مساوات سے قرآن کی بدیہی روگردانی کو اسی سیاق وسباق میں دیکھنا چاہیے۔ جنوری 626ء میں آپؐ کی نئی زوجہ حضرت زینبؓ کا انتقال ہو گیا (صرف 8 ماہ رفاقت کے بعد)۔ کچھ عرصہ بعد آپؐ نے ہند بنت ابی امیہ، آپؐ کے کزن ابو سلمہ کی بیوہ (جو احد میں شہید ہوئے) سے رابطہ کیا جس کے چار بچے تھے۔ ہند عرف اِمِ سلمہ کی عمر 29 برس تھی؛ وہ خوب صورت، شائستہ اور نہایت ذہین تھیں۔ انہوں نے آپؐ کو حضرت خدیجہؓ جیسی ہی رفاقت مہیا کی۔ وہ ایک طاقتور کی قبیلے بنو مخزوم کے سرکردہ سردار کی بہن بھی تھیں۔ ابتدا میں انہوں نے رشتہ قبول کرنے میں کچھ تذبذب دکھایا اور وضاحت کی کہ آپؐ اپنے شوہر سے بہت محبت کرتی تھیں؛ اب جوان نہیں رہی تھیں، مزاج حاسدانہ ہو گیا تھا اور حرم کی زندگی سے مطابقت اختیار کر سکنے کے متعلق پُر یقین نہ تھیں۔ آنحضرتؐ یہ بات سن کر مسکرا دیے ــــ وہی عظیم میٹھی مسکراہٹ جو ہر کسی کو پسپا کر دیتی تھی۔ آپؐ نے حضرت اِمِ سلمہؓ کو تسلی دی کہ آپؐ خود بھی اب پُر شباب نہیں اور حسد کا تدارک اللہ کر دے گا۔

حضرت اُمِ سلمہؓ کی تشویش بجا تھی، کیونکہ مسجد میں زندگی زیادہ آسان نہ تھی۔[40] ازدواج مطہرات کے لیے بنائے گئے حجرے اس قدر چھوٹے تھے کہ اندر سیدھا کھڑا ہونا بھی مشکل تھا۔ حضرت محمدؐ کے پاس اپنا کوئی گھر نہ تھا۔ آپؐ باری باری ہر بیوی کے پاس رات گزارتے اور اس دن کے لیے بیوی کا حجرہ ہی آپؐ کی باضابطہ رہائش گاہ ہوتا۔ عملاً کوئی نجی رازداری نہ تھی کیونکہ آپؐ متواتر لوگوں کے درمیان گھرے رہتے۔ آپؐ اکثر اپنی بیٹیوں اور نواسوں سے بھی ملنے جاتے۔ حضرت علیؓ اور حضرت فاطمہؓ کے بیٹے حسنؓ اور حسینؓ سے آپؐ کو خصوصی محبت تھی۔ اپنی ننھی نواسی اُمامہ کو آپؐ اپنے کندھوں پر بٹھا کر مسجد میں تشریف لاتے۔ قریب ترین ساتھی (صحابہ) متواتر آپؐ کے ساتھ رہتے: حضرت ابو بکرؓ، حضرت زیدؓ، حضرت علیؓ، حضرت عثمانؓ اور حضرت عمرؓ۔ عرب میں آپ کے عزت واحترام میں اضافہ ہونے پر بدوی قبائل کے وفود بھی ملاقات کے لیے آنے لگے جو اپنے اونٹوں کے ساتھ صحن میں مقیم ہوتے۔

جب آپؐ نماز کے بعد مسجد سے باہر تشریف لاتے تو سائلین آپؐ کو اپنے حلقے میں لے لیتے اور دو بدو ہو کر اپنے مسائل اور مطالبات پیش کرتے۔[41] وہ آپؐ کے پیچھے پیچھے حجرے میں چلے جاتے، میز کے گرد اس قدر قریب قریب بیٹھ جاتے کہ کبھی کبھی نوالہ لینا بھی دشوار ہو جاتا۔[42] کم گو، نفاست و صفائی پسند پیغمبرؐ کے لیے یہ بہت مشکل وقت ہوتا کیونکہ آپؐ جسم اور سانس کی بدبو کو ناپسند کرتے تھے۔ آپؐ اب بھی اس قدر سبک اندام تھے کہ پاؤں بمشکل زمین کو چھوتے دکھائی دیتے، لیکن آپؐ کی عمر 60 کے قریب ہو چلی تھی۔ اُحد میں آپؐ زخمی بھی ہو چکے تھے۔ مصروفیات کا بڑھتا ہوا بار گراں ہو گیا، جبکہ مدینہ مکی فوج کی دوبارہ آمد کا منتظر تھا۔ امت میں بھی بے چینی اور انتشار دکھائی دینے لگا۔

جونہی ام سلمہؓ نے حجرے میں رہائش اختیار کی خانگی بے چینی ظاہر ہونے لگی۔ حضرت عائشہؓ اس ممتاز خاتون کی آمد پر نالاں تھیں اور نتیجتاً اندرونِ خانہ جنم لینے والی گڑبڑ امت میں موجود تشویشات کی عکاس تھی۔ حضرت امِ سلمہؓ نسبتاً زیادہ ارستقراطی (ارسٹوکریٹک) مہاجرین کی نمائندہ تھیں، جبکہ حضرت عائشہؓ بنت ابوبکرؓ اور حضرت حفصہؓ بنت عمرؓ کا تعلق زیادہ عوامی طبقے سے تھا۔ ازدواج مطہرات نے ان دو دھڑوں میں سے کسی ایک کا ساتھ دیا۔ حضرت امِ سلمہؓ نے عموماً تیسرے گروہ یعنی اہل البیت کی حمایت کی جو آنحضرتؐ کے اپنے گھرانے کے ارکان تھے۔ آپؐ کے ساتھ ان کی شادی کے وقت یہ دھڑے محض اپنے ابتدائی دور میں تھے، لیکن جلد ہی واضح ہونے لگا کہ اُمت ایک یکجان گروپ نہیں تھی، اور یہ کہ اسلام میں داخل ہونے والے لوگ بالکل مختلف توقعات لیے ہوئے تھے۔

حضرت امِ سلمہؓ فوراً ہی مدینہ کی عورتوں کی ترجمان بن گئیں۔[44] آنحضرتؐ کی رہائش امت کے مرکز میں ہونے کی وجہ سے مسلمان عورتوں کے کردار کو ایک نئی جہت ملی۔ حضرت عائشہؓ اور حضرت حفصہؓ ابھی تک جوان لڑکیاں تھیں اور وہ کبھی کبھی تیز مزاجی کا مظاہرہ بھی کرتیں، لیکن حضرت امِ سلمہؓ کا مزاج بہت مختلف تھا۔ حضرت امِ سلمہؓ کی شادی کے کچھ ہی عرصہ بعد عورتوں کے ایک وفد نے پوچھا کہ قرآن میں ان کا ذکر اس قدر کم کیوں آیا ہے۔ ام سلمہؓ نے یہ مسئلہ آنحضرتؐ کے سامنے رکھا۔ آپؐ نے معمول کے مطابق کچھ عرصہ اس بارے میں سنجیدگی سے غور و فکر کیا۔ چند

روز بعد جب وہ اپنے حجرے میں بیٹھی بال سنوار رہی تھیں تو آنحضرتؐ کو مسجد میں ایک نئی انقلابی سورۃ کی تلاوت فرماتے سنا:

یقیناً مسلمان مرد اور مسلمان عورتیں،
اور مومن مرد اور مومن عورتیں،
اور فرمانبردار مرد اور فرماں بردار عورتیں،
اور سچے مرد اور سچی عورتیں،
اور صبر کرنے والے مرد اور صبر کرنے والی عورتیں،
اور صدقہ کرنے والے مرد اور صدقہ کرنے والی عورتیں،
اور روزہ رکھنے والے مرد اور روزہ رکھنے والی عورتیں،
اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرنے والے مرد اور حفاظت کرنے والی عورتیں
اور اللہ کو کثرت سے یاد کرنے والے مرد اور کثرت سے یاد کرنے والی عورتیں
اللہ نے ان سب کے لیے مغفرت اور اجر عظیم تیار کیے ہوئے ہیں۔ (45)

بہ الفاظ دیگر، اسلام میں مکمل جنسی مساوات قرار پائی؛ مرد اور عورتیں دونوں ایک جیسے فرائض اور ذمہ داریوں کے حامل تھے۔ جب عورتوں نے یہ آیات سنیں تو ان آیات کو اپنی زندگیوں میں مجسم روپ دینے کا تہیہ کرلیا۔

اللہ عورتوں کا طرف دار معلوم ہوتا تھا۔ کچھ ہی عرصہ بعد پوری ایک سورۃ عورتوں سے منسوب کی گئی۔ اب عورتیں اونٹوں یا کھجور کے درختوں کی طرح مردوں کو ترکہ میں نہیں منتقل ہوتا تھیں۔ وہ خود بھی میراث چھوڑ سکتی اور جاگیر میں حصے کے لیے مردوں کے ساتھ مقابلہ کرسکتی تھیں۔ (46) کسی یتیم لڑکی کی مرضی کے خلاف اس کی شادی سرپرست سے نہیں ہوسکتی تھی، کہ جیسے وہ محض منقولہ جائیداد ہو۔ (47) قبل از اسلام عہد کی طرح عورتوں کو خلع لینے کا حق حاصل رہا، البتہ شوہر یہ درخواست مسترد کرسکتا تھا۔ عرب میں دُلہا دُلہن کو روایت کے مطابق جہیز پیش کیا کرتا تھا، لیکن عملاً

یہ تحفہ اس کے گھر والوں کو ملتا۔ اب عورت براہِ راست اس کی حق دار قرار پائی، اور طلاق کی صورت میں مرد جہیز واپس نہیں مانگ سکتا تھا۔[48] قرآنی قانون نے اصرار کیا کہ فرد آزاد اور خود مختار تھا۔ اور یہ اصول عورتوں پر بھی نافذ ہوا۔

ساتویں صدی عیسوی کے عرب میں یہ ایک حیرت انگیز جدت تھی، اور امت کے مرد کافی سیخ پا ہوئے۔ اللہ مردوں سے ان کی خصوصی مراعات چھین رہا تھا! وہ آنحضرتؐ کی خاطر لڑ مرنے کو تیار ہوئے تھے، لیکن اب آپؐ ان سے نجی زندگیوں کی قربانی مانگ رہے تھے! بالخصوص اہلِ مدینہ بہت برہم ہوئے: کیا اب کھیتوں اور جائیداد میں سے عورتوں کو بھی حصہ دینا پڑے گا؟ انہوں نے پوچھا، ''آپ عورتوں اور بچوں کو ترکے کا حق کیسے دے سکتے ہیں جو کام کرتے ہیں اور نہ روزی کماتے ہیں؟ کیا وہ محنت مزدوری کرنے والے مردوں کی طرح ہی جائیداد ترکہ میں حاصل کریں گے؟'' کیا آنحضرتؐ واقعی سنجیدگی سے انہیں بتا رہے تھے کہ ایک بدصورت لڑکی کو بھی جائیداد ترکہ میں ملے گی؟ ''ہاں، بالکل،'' آپؐ نے جواب دیا۔[49] کچھ لوگوں نے قانون میں جحت کرنا چاہی، لیکن عورتوں نے آپؐ سے شکایت کی اور قرآن نے ان کی حمایت کی۔[50]

عورتوں نے ایک اور مطالبہ بھی کیا: چونکہ لوٹ مار کی مہم معیشت کے لیے نہایت ضروری تھی، اس لیے وہ بھی ہتھیار کیوں نہ اٹھائیں؟ ایک مرتبہ پھر حضرت امِ سلمہؓ نے ان کا یہ سوال حضرت محمدؐ تک پہنچایا۔[51] یہ بات براہِ راست غزو معیشت کے قلب سے منسلک تھی۔ جنگ میں قید ہونے والی عورت گراں قدر مالِ غنیمت تھی؛ اسے بیچا، بیاہا یا قحبگی پر مجبور کیا جا سکتا تھا۔ اگر عورتوں کو محض قیدی بننے کا انتظار کرنے کی بجائے جنگ میں لڑنے کی اجازت دے دی جاتی تو غزو کی آمدنی میں زبردست کمی آتی۔ اس تنازع نے امت کو تقسیم کر دیا اور حضرت محمدؐ کو ناراض مردوں نے گھیر لیا جو محسوس کرتے تھے کہ اللہ ان کی حق تلفی کر رہا ہے۔ بالخصوص حضرت عمرؓ عورتوں کے لیے آنحضرتؐ کی ایک حمایت کو نہ سمجھ پائے لیکن آپؐ اپنے موقف پر ڈٹے رہے اور اصرار کیا کہ اللہ نے اپنی منشا واضح کر دی تھی۔

لیکن عورتوں نے اپنی تحریک کے لیے ایک غلط موقع کا انتخاب کیا تھا۔ مرد کسی بھی صورت میں ایسے وقت پر یہ بات قبول نہیں کر سکتے تھے جب امت کے وجود کو خطرہ لاحق ہوتا۔ وراثت اور

طلاق کے قوانین اپنی جگہ قائم رہے لیکن آنحضرتؐ کو پتا چلا کہ مدینہ میں آپؐ کے دشمن اس انقلابی قانون کا سیاسی فائدہ اٹھا رہے ہیں اور یہ کہ کچھ قریبی ساتھی مخالف بن گئے ہیں۔ عورتوں کو مارنے پیٹنے جیسے مسائل پر سوالات سننے میں آنے لگے۔[52] قرآن نے مسلمانوں کو ایک دوسرے کے خلاف تشدد سے منع کیا تھا، اور عورتوں کو ان کے شوہر تشدد کا نشانہ بناتے تو وہ شکایت لے کر آنحضرتؐ کے پاس آتیں اور مطالبہ کرتیں کہ ان کو قرآن کے مطابق سزا دی جائے۔ کچھ ایک نے تو اپنے ظالم شوہروں کے ساتھ ہم بستری سے بھی انکار کر دیا۔ عورتوں پر تشدد کا تصور بھی آپؐ کو ناپسند تھا۔ آپؐ نے کبھی اپنی کسی بیوی پر ہاتھ نہ اٹھایا۔ ابن سعد لکھتا ہے: ''حضرت محمدؐ نے کبھی کسی لونڈی یا کسی بھی شخص پر تشدد نہ کیا۔ آپؐ عورتوں کو مارنے پیٹنے کے ہمیشہ سے خلاف تھے۔''[53] مگر آپؐ اپنے دور سے بہت آگے سوچ رہے تھے۔ قریب ترین صحابہ بھی اپنی بیویوں کو مار پیٹ لیتے تھے۔ مدینہ پر چڑھائی کے لیے ابوسفیان کی تیاریوں کے پیشِ نظر آپؐ کے اپنے ساتھیوں میں اتحاد پیدا کرنا ضروری تھا۔ آپؐ نے اپنے ساتھیوں سے کہا، ''ٹھیک ہے، تم انہیں مار سکتے ہو، لیکن تم میں سے بدترین لوگ ہی ایسا کریں گے۔''

لگتا ہے کہ ایک آیت میں بیویوں کو مارنے پیٹنے کی اجازت دی گئی، لیکن آنحضرتؐ اس بات کو پسند نہیں کرتے تھے۔[55] ''میں کسی تیز مزاج شخص کو اپنی بیوی کی پٹائی کرتے نہیں دیکھ سکتا،'' آپؐ نے فرمایا۔[56] ایک مرتبہ پھر مکہ کے ساتھ لڑائی نے آپؐ کو ایسی ڈگر اپنانے پر مجبور کیا جو آپؐ معمول کے حالات میں ہرگز پسند نہ فرماتے۔ عورتوں کے متعلق قرآنی آیات جنگ سے متعلق آیات میں الجھی ہوئی ہیں (جس نے اس دور میں مدینہ کے تمام واقعات پر ناگزیر اثرات مرتب کیے)۔ آپؐ جانتے تھے کہ بے دل فوج کے ذریعے مکی حملے کا دباؤ برداشت نہیں کیا جا سکتا۔

☆

مارچ 627ء میں دس ہزار افراد کی ایک وسیع فوج — قریش اور ان کے حلیف — مدینہ کی طرف روانہ ہوئی۔[57] آنحضرتؐ مدینہ اور بدوی حلیفوں میں سے صرف تین ہزار سپاہی جمع کر سکے۔ اس مرتبہ کوئی غیر ضروری بہادری نہ دکھائی گئی۔ مسلمانوں نے خود کو نخلستان کے قلب میں ''شہر'' کے اندر بند کر لیا۔ تین اطراف سے چٹانی پہاڑوں اور سنگلاخ میدان میں گھرے ہوئے

مدینہ کا دفاع کرنا مشکل نہیں تھا۔ صرف شمالی طرف زد پذیر تھی، لیکن آنحضرتؐ نے حضرت سلمان فارسی کی بتائی ہوئی ایک حکمتِ عملی اپنائی۔ قریش عجلت میں نہ تھے۔ وہ پُر جلال اور پُر اعتماد انداز میں منزل بہ منزل آگے بڑھے، اس لیے مسلمانوں کو کافی وقت مل گیا۔ انہوں نے بیرونی کھیتوں میں سے فصل اکٹھا کر لی، تاکہ اہلِ مکہ کو اپنے جانوروں کے لیے خوراک نہ ملے۔ تب ساری امت نخلستان کے شمالی حصے میں ایک بہت بڑی خندق کھودنے میں لگ گئی۔ عرب لوگوں کے لیے یہ چیز نہایت حیرت انگیز، بلکہ بوکھلا دینے والی تھی۔ کوئی بھی متفاخر جاہلی جنگجو اپنے اور دشمن کے درمیان رکاوٹ کھڑی کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ غلاموں کی طرح کدال سے مٹی کھودنا ان کے نزدیک باعث ذلت تھا، لیکن آنحضرتؐ نے سب کے ساتھ مل کر کام کیا اور ان کا حوصلہ بڑھاتے رہے۔ جذبہ اپنے عروج پر تھا۔

جب قریش اپنی فوج کے ہمراہ وہاں پہنچے تو پھٹی ہوئی آنکھوں سے خندق کو دیکھا۔ خندق سے نکلنے والی مٹی کی مدد سے ایک اونچا مورچہ بنایا گیا تھا جس نے اہلِ مدینہ کے لیے ڈھال بنادی اور انہیں تیر چلانے کے لیے ایک اچھا مقام بھی دے دیا۔ قریش ششدر رہ گئے۔ انہوں نے اپنی زندگی میں کبھی ایسی چیز نہیں دیکھی تھی۔[58] ان کے فخر اور مسرت کا باعث گھوڑ سوار رسالہ بے کار تھا۔ وقتاً فوقتاً ان کا کوئی گھوڑ سوار دشمن کی صفیں چیرنے کی کوشش کرتا لیکن کھائی کے قریب پہنچ کر رک جاتا۔

محاصرہ صرف ایک ماہ جاری رہا، لیکن یہ غیر مختتم لگتا تھا۔ مدینہ کے حلیفوں اور اپنے لوگوں کی غذا کا بھی بندوبست کرنا شہر کے وسائل پر ایک بھاری بوجھ بن گیا۔ ابن ابیعہ اور اس کے ساتھیوں نے آنحضرتؐ کو اپنی تباہی کا ذمہ دار ٹھہرایا،[59] اور یہودی قبیلے قریظہ نے کھلِ عام قریش کا ساتھ دیا۔ خیبر کے یہودیوں نے ایک کافی بڑا دستہ مکی فوج میں شمولیت کے لیے بھیجا جس میں جلاوطن بنو نضیر کے کئی لوگ بھی شامل تھے۔ مکی فوج کی آمد سے قبل حیی ابن اخطب (بنو نضیر کا سردار) قریظہ کو مسلمانوں پر عقب سے حملہ کرنے یا دو ہزار نضیریوں کو نخلستان بھجوانے پر مائل کرنا چاہا تا کہ قلعوں میں عورتوں اور بچوں کو قتل کیا جا سکے۔ ابتداً میں بنو قریظہ متذبذب ہوئے، لیکن جب انہوں نے کثیر التعداد مکی فوج کو شہر کے سامنے میدان میں تاحدِ نظر پڑاؤ ڈالتے دیکھا تو ان کا سردار اتحاد کی

مدد کرنے اور قریظہ کو ہتھیار اور رسد بہم پہنچانے پر تیار ہو گیا۔ آنحضرتؐ نے اس سازش کے متعلق سنا تو بہت پریشان ہوئے۔ انہوں نے سعد ابن معاذ — جو ہجرت سے قبل قریظہ کا مرکزی عرب حلیف رہ چکا تھا — کو مذاکرات کرنے بھیجا، مگر بے سود۔ ایک موقعہ پر تو قریظہ نے واقعی آبادی کے جنوب مشرق کی طرف سے قلعوں پر حملہ شروع کر دیا، لیکن کوشش ناکام ہوئی۔ تقریباً تین ہفتے تک بالکل واضح نہ ہو سکا کہ وہ کس طرف جائیں گے۔

غزوۂ خندق کے سارے عرصے کے دوران مسلمان خوفزدہ رہے۔ نابود ہو جانے کے واضح امکان نے کچھ ایک کو مایوس کر دیا۔ قرآن میں ارشاد ہوا، ''تمہاری آنکھیں پھٹ گئیں اور تمہارے دل منہ کو آئے، جبکہ تم اللہ کے متعلق عجیب سوچوں میں گم تھے؛ اہلِ ایمان کو آزمایا گیا اور انہیں زور سے ہلایا گیا۔''(60) لیکن شہر کے اندر موجود لوگ بھی خوف سے کانپ رہے تھے، جبکہ خندق کی دوسری طرف قریش کی ہمت جواب دے رہی تھی۔ ان کے پاس رسد ناکافی تھی اور عسکری امور میں ناتجربہ کاری کا مطلب تھا کہ اچانک پسپائی ان کے حوصلے بھی پسپا کر دے گی۔ آخرکار جب ایک طوفان باد و باراں نے ان کے پڑاؤ میں تباہی مچائی تو ان کا عزم پارہ پارہ ہو گیا۔ ابوسفیان نے شکست تسلیم کی۔ گھوڑے اور اونٹ مر رہے تھے، قریظہ مدد کو نہ آ سکے، سپاہیوں کے پاس خیمے، ایندھن یا کھانا پکانے کے برتن نہیں تھے۔ اس نے اپنے آدمیوں سے کہا، ''تم چلے جاؤ، کیونکہ میں بھی جا رہا ہوں۔''(61) جب مسلمانوں نے اگلے روز پڑاؤ پر نظر ڈالی تو میدان خالی نظر آیا۔

لیکن آنحضرتؐ بنو قریظہ کا کیا کرتے؟ قریش کی روانگی نے مدینہ کے اندر آپؐ کی قیادت کی شدید مخالفت کو کم نہ کیا تھا: مخالفین کو یقین تھا کہ اہلِ مکہ بہت جلد واپس آئیں گے اور اپنی بے عزتی کا خوفناک بدلہ لیں گے، لہٰذا انہوں نے آنحضرتؐ کے خلاف اپنی مہم بہت تیز کر دی۔ شہر پر خانہ جنگی کا خطرہ منڈلا رہا تھا اور اس دھماکہ خیز ماحول میں قریظہ کو سزا دیے بغیر نہیں چھوڑا جا سکتا تھا۔ مکی فوج کی واپس روانگی کے اگلے روز حضرت محمدؐ کی افواج نے قریظہ کے قلعے کو محاصرے میں لے لیا جنہوں نے کہا کہ انہیں بھی قینقاع اور نضیر والی شرائط پر شہر سے چلے جانے کی اجازت دی جائے۔ لیکن اس مرتبہ آنحضرتؐ نے انکار کر دیا: بنو نضیر جلاوطنی میں بھی امت کے لیے کچھ کم خطرناک نہیں ثابت ہوئے تھے۔ قریظہ کے بزرگ اپنے سابق حلیف سعد ابن معاذ کی ثالثی پر رضامند ہو گئے جو

محاصرے کے دوران شدید زخمی ہوا تھا اور اسے ایک چارپائی پہ ڈال کر بنوقریظہ کے گاؤں میں لے جایا گیا تھا۔ اگرچہ کچھ دیگر قبائل نے رحم کی درخواست کی، لیکن سعد کو یقین تھا کہ قریظہ سلامتی کے لیے ناقابلِ مصالحت خطرہ تھے اور انہوں نے روایت کے مطابق فیصلہ دیا: قبیلے کے تمام سات سو مردوں کو مار ڈالا جائے، ان کی عورتوں اور بچوں کو بطور غلام فروخت کیا جائے اور ان کی جائیداد مسلمانوں کے درمیان بانٹ دی جائے۔ روایت ہے کہ یہ فیصلہ معلوم ہونے پر حضرت محمدؐ نے فرمایا: ''تم نے سات آسمانوں کے اوپر موجود اللہ کے حکم پر عمل کیا ہے!''[62] اگلے روز سزا دہی شروع ہوگئی۔

اگرچہ آج ہمیں یہ بات کچھ ناگوار لگے گی، لیکن عرب میں تقریباً ہر کوئی سعد کے فیصلے کی ہی توقع رکھتا تھا۔ کتب کے مطابق بنوقریظہ بھی اس فیصلے پر ششدر نہ ہوئے۔ اس سزا دہی نے خیبر کے یہودیوں کو ایک خوفناک پیغام دیا، اور بدوؤں نے دیکھا ہوگا کہ مسلمان جوابی کارروائی سے گریز نہیں کریں گے۔ آپؐ نے طاقتور کا بھرپور مظاہرہ کیا جو (امید تھی کہ) جھگڑے کو ختم کر دے گا۔ اس بے چین، قدیمی معاشرے میں تبدیلی آ رہی تھی، لیکن فی الحال اس وسیع پیمانے پر قتل و غارت گری مقبولِ عام وستور تھی۔[63]

بایں ہمہ، یہ واقعہ حضرت محمدؐ کے کیریئر کا نقطۂ عروج ہے۔ تاہم، یہ امر قابل ذکر ہے کہ بنوقریظہ کو مذہبی یا نسلی بنیادوں پر نشانہ نہیں بنایا گیا تھا۔ نخلستان کے کسی بھی اور یہودی قبیلے نے اعتراض یا مداخلت نہ کی۔ عرب قبیلے بنوکلاب کے متعدد افراد بھی موت کے گھاٹ اتارے گئے۔ آنحضرتؐ کا یہودیوں کے ساتھ کوئی نظریاتی تنازع نہ تھا۔ ایک مرتبہ آپؐ نے ارشاد فرمایا: ''جو کوئی بھی کسی یہودی یا عیسائی کے ساتھ غلط سلوک کرتا ہے، وہ روزِ قیامت جوابدہ ہوگا۔'' بنوقریظہ غداری کی وجہ سے قتل ہوئے۔ نخلستان کے دیگر سترہ یہودی قبیلے نخلستان میں ہی کئی سال تک مسلمانوں کے ساتھ دوستانہ انداز میں زندگی گزارتے رہے اور قرآن بدستور اصرار کرتا رہا کہ مسلمان اہل الکتاب کے ساتھ اپنی روحانی قرابت یاد رکھیں:

اور اہل الکتاب سے بحث نہ کرو مگر اس سے جو بہترین ہو سوائے ان کے جنہوں

نے ان میں ظلم کیا ہو۔ اور کہو کہ ہم ایمان لے آئے ہیں اس پر جو ہماری طرف اتارا گیا اور اس پر جو تمہاری طرف اتارا گیا اور ہمارا معبود اور تمہارا معبود ایک ہی ہے اور ہم اسی کے فرماں بردار ہیں۔ (64)

بعدازاں اسلامی سلطنتوں میں یہودیوں کو مکمل مذہبی آزادی حاصل رہی اور سامیت مخالف جذبہ بیسویں صدی کے وسط میں عرب اسرائیل تنازع کھڑا ہونے سے پہلے تک مسلمانوں میں پیدا نہ ہوا۔

بنوقریظہ کا المناک انجام عہد پیغمبرؐ کے عربوں کو ناگزیر معلوم ہوا ہوگا، لیکن آج یہ ہمارے لیے قابلِ قبول نہیں۔ مسلمانوں کا اصل مقصد جاہلیہ کا خاتمہ کرنا نہیں، لیکن اب وہ کسی عام عرب سردار کی طرح ہی رویہ اپنائے ہوئے تھے۔ آپؐ نے حتمی امن حاصل کرنے کی خاطر جنگ کی ضرورت محسوس کی، لیکن لڑائی نے وار اور جوابی وار، دست درازی اور جوابی کارروائی کا ایک ظالمانہ گھن چکر شروع کر دیا تھا جو اسلام کے اساسی اصولوں کے خلاف تھا۔ جب حضرت محمدؐ بنوقریظہ کے گاؤں سے شہر کی جانب واپس تشریف لا رہے تھے تو آپؐ نے لازماً محسوس کیا ہوگا کہ فساد ختم کرنے کی خاطر کوئی اور طریقہ ڈھونڈنا پڑے گا۔ مسلمانوں کو جاہلی طرزِ عمل یکسر ترک کرنا اور ایک قطعی مختلف حل تلاش کرنا تھا۔

باب 5

سلام

قریش پر آنحضرتؐ کی فتح نے جزیرہ نما میں آپؐ کا مرتبہ بہت بلند کر دیا۔ آئندہ چند ماہ کے دوران آپؐ نے اس حیثیت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ان قبائل کے خلاف مہمات روانہ کیں جنہوں نے مکہ والوں کے ساتھ اتحاد قائم کیا تھا۔ آپؐ کا مقصد قریش کی زبوں حالی تجارت کو مزید نقصان پہنچانا اور کچھ شامی کاروانوں کو مدینہ کی جانب راغب کرنا تھا۔ آپؐ کی متواتر کامیابی کو دیکھ کر بہت سے عرب اپنے روایتی عقیدے کے کارآمد ہونے پر سوال اٹھانے لگے۔ وہ تجربیت پسند لوگ تھے اور مذہبی نظام کے مؤثر پن کی نسبت تجریدی قیاس آرائیوں میں کم دلچسپی رکھتے تھے۔ جب مکی فوج محاصرے کے بعد مدینہ سے چلی گئی تو سپہ سالار خالدؓ بن ولید نے پکارا: ''اب ہر ذی ہوش جانتا ہے کہ آنحضرتؐ نے جھوٹ نہیں کہا تھا!''[1] حتیٰ کہ پرانے عقیدے کے نہایت راسخ پیروکار بھی اتفاق کرنے لگے۔ ایک مکی کاروان کے خلاف مہم کے دوران آنحضرتؐ کے

سابق داماد ابوالعاص (جو اسلام قبول کرنے کے بجائے اپنا خاندان چھوڑنے کو تیار ہو گئے تھے) قیدی بنا کر لائے گئے۔ آنحضرتؐ نے حکم دیا کہ انہیں رہا کر کے سامان انہیں لوٹا دیا جائے۔ اس فیاضانہ اقدام نے ابوالعاص کو اس قدر متاثر کیا کہ مکہ پہنچ کر انہوں نے ہجرت کی، اسلام قبول کیا اور حضرت زینبؓ اور ننھی بیٹی کو دوبارہ اپنا لیا۔

بحیثیت مجموعی عرب میں طوفان کا رخ حضرت محمدؐ کے حق میں ہو گیا تھا، لیکن مدینہ کے اندر اس کے برعکس صورت تھی۔ وہاں تنازع پہلے کی نسبت کہیں زیادہ سنگین ہو گیا۔ ابن ابیعہ ہر روز بدستور سردار ہونے کا دعویٰ کرتا۔ اس کا کہنا تھا کہ یثرب عرب کے طاقتور ترین شہر کی دشمنی مول لیے بغیر بھی پُرامن رہ سکتا تھا۔ آنحضرتؐ کے دشمنوں نے شاذ ہی کبھی آپؐ پر کھل عام وار کیا، بلکہ انہوں نے چوری چھپے ایک سازشی مہم جاری رکھی۔ عورتوں کی حالت بہتر بنانے کے لیے آنحضرتؐ کی کاوشیں ان کی نظر میں ایک غیر متوقع رحمت تھی۔ لہٰذا، وہ ازواج مطہرات کے متعلق بہتان طرازی کرنے لگے۔ کچھ نے خبر اڑائی کے وہ پیغمبر کے خاندان کی زیادہ حسین خواتین سے شادی کرنا چاہتے ہیں۔ (جب وہ نعوذ باللہ بیوہ ہو جائیں گی)۔۔۔ اس نیت میں آنحضرتؐ کو قتل کرنے کی سازش کا واضح اشارہ موجود تھا۔ افواہ پھیلائی گئی کہ اب آنحضرتؐ اپنی زوجین کی تسکین کے قابل نہیں رہے تھے۔[3] حضرت عائشہؓ اور صفوان بن المعطل کے حوالے سے بھی افواہیں گردش میں آئیں۔ جب لوگ سوالات کرنے آپؐ کے گھر کی طرف جوق در جوق آئے تو کچھ لوگوں نے آپؐ کی موجودگی میں ازواج مطہرات پر کیچڑ اچھالی۔ صورت حال قابو سے باہر ہوتی جا رہی تھی۔ رات کے وقت جب ٹھنڈک ہوتی تو مدینہ میں زندگی کا دھارا تیزی سے بہنے لگتا اور تب لوگ باہر نکل کر چہل قدمی کرنا اور آپس میں ملنا جلنا پسند کرتے تھے۔ وہ تازہ ہوا کا لطف لیتے، لیکن محاصرے کے بعد سے گلیوں، بازاروں میں عورتوں پر دست درازی ہونے لگی۔ جب پیغمبر کی بیویاں اکٹھی باہر نکلتیں تو منافقین ان کے پیچھے لگ جاتے اور فحش بکتے۔[4] اعتراض کیے جانے پر وہ کہتے کہ تاریکی کے باعث وہ انہیں لونڈیاں سمجھ بیٹھے تھے، جو اس قسم کی حرکات کے لیے مرغوب ترین معروض ہوا کرتی تھیں۔

گزشتہ چند برس کے ذہنی دباؤ نے جذباتی اور جسمانی لحاظ سے آنحضرتؐ کو بہت متاثر کیا

تھا۔ آپؐ جذباتی لحاظ سے ہمیشہ اپنی ازدواج پر منحصر رہے تھے۔ اس چیز نے آپؐ کو زد پذیر بنا دیا۔ جب آپؐ نے ایک اور خاتون کو زوجہ بنانے کا فیصلہ کیا تو زبانیں دوبارہ حرکت میں آئیں۔[5] حضرت زینبؓ بنت جحش ہمیشہ سے آپؐ کے قریب رہی تھیں؛ وہ آپؐ کی کزن لیکن آپؐ کے منہ بولے بیٹے زیدؓ کی بیوی تھیں۔ آپؐ نے یہ رشتہ ہجرت کے کچھ ہی عرصہ بعد خود کروایا تھا حالانکہ حضرت زینبؓ اس رشتے کے معاملے میں زیادہ مشتاق نہ تھیں۔ زیدؓ جسمانی اعتبار سے پرکشش نہ تھے...... تب حضرت زینبؓ کی عمر تیس دہائی کے آخر میں پہنچ چکی تھی، لیکن عرب کی شدید آب وہوا اور حالات کے باوجود آپؓ اب بھی حسین وجمیل تھیں۔ وہ پرہیزگار اور چمڑے کی مصنوعات بنانے میں ماہر تھیں۔ وہ اپنی ساری آمدنی غریبوں میں بانٹ دیتیں۔ ایک روز آنحضرتؐ زیدؓ سے کوئی بات کرنے ان کے گھر گئے لیکن وہ موجود نہ تھے۔ حضرت زینبؓ لاعلمی میں بے حجاب دروازے سے باہر آئیں تو آنحضرتؐ نے فوراً اپنی نظریں دوسری طرف کر لیں اور فرمایا: ''تعریف اس اللہ کی جو انسانوں کے دل موڑ دیتا ہے!'' کچھ ہی عرصہ بعد حضرت زینبؓ کو حضرت زیدؓ نے طلاق دے دی۔ ان کی ازدواجی زندگی کبھی بھی خوشگوار نہیں رہی تھی اور زیدؓ نے بخوشی انہیں آزاد کر دیا۔ اس واقعے نے آنحضرتؐ پر تنقید کرنے والے کچھ مغربی سوانح نگاروں کو بوکھلا کر رکھ دیا جو مرتاض مسیحی ہیرو دَں کے عادی تھے، لیکن مسلم مورخین کے نزدیک اس میں کوئی قباحت نہ تھی۔ نہ ہی وہ حضرت محمدؐ کی چار سے زائد بیویوں کے سلسلے میں پریشان لگتے ہیں: اللہ اپنے پیغمبر کو کچھ مراعات سے کیوں نہ نوازتا؟ مدینہ میں آپؐ کے مخالفین نے اس امر کا سکینڈل بنایا کہ حضرت زینبؓ، حضرت زیدؓ کی بیوی رہ چکی تھیں: عرب لوگ لے پالک بیٹے کو بھی سگے بیٹے جیسا خیال کرتے تھے۔ ایک آیت میں اس حوالے سے آنحضرتؐ کو تسلی دی گئی؛ اللہ نے خود یہ رشتہ منظور کیا تھا اور لے پالک بیٹے کی سابقہ بیوی سے شادی کرنا گناہ کا باعث نہ تھا۔[6] تیز مزاج حضرت عائشہؓ بھی یہ وحی وصول ہونے کے وقت آپؐ کے پاس موجود تھیں۔ انہوں نے فرمایا، ''آپ کا خدا آپ کو کتنی جلدی اجازت دے دیتا ہے!'' ایک مرتبہ پھر حرم کے اندرونی تناؤ نے بحیثیت مجموعی امت کے تناؤ کی عکاسی کی: اپنی ایک کزن کے ساتھ حضرت محمدؐ کی شادی نے آپؐ کے خاندان کے سیاسی مقاصد کو آگے بڑھایا اور اہل البیت کے نصب العین کی حمایت کی۔

سکینڈل کی وجہ سے حضرت محمدؐ نے اصرار کیا کہ ساری امت شادی کی تقریبات میں شریک ہو؛ صحن مہمانوں سے بھرا ہوا تھا جن میں آپؐ کے کئی دشمن بھی شامل تھے۔ ماحول خوشگوار نہیں ہو سکتا تھا۔ انجام کار امت میں رخنے پیدا ہونے لگے، لیکن ایک چھوٹا سا گروہ حضرت زینبؓ کے نئے حجرے کے پیچھے ہی رہا اور انہیں معلوم نہیں تھا کہ یہ نو بیاہتا شوہر اور بیوی کے تخلیے کا وقت ہے۔ آنحضرتؐ کمرے سے نکل کر اپنی دوسری زوجین کے ساتھ جا بیٹھے تاکہ یہ مہمان کچھ اشارہ پا سکیں۔ حضرت عائشہؓ نے پوچھا: ''آپ کو اپنی نئی ساتھی کیسی لگی؟'' انجام کار جب آپؐ واپس حضرت زینبؓ کے حجرے میں تشریف لائے جہاں سے آپؐ کے دوست انسؓ بن مالک نے لوگوں کو بھگا دیا۔ کمرے میں داخل ہونے پر آپؐ نے اپنے اور انسؓ کے درمیان ایک حجاب کھینچتے ہوئے ایک نئی وحی کے الفاظ تلاوت فرمائے:

> اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو، نبی کے گھروں میں داخل نہ ہوا کرو سوائے اس کے کہ تمہیں کھانے کی دعوت دی جائے مگر اس طرح نہیں کہ اس کے پکنے کا انتظار کر رہے ہو لیکن جب تمہیں بلایا جائے تو داخل ہو جاؤ اور جب تم کھا چکو تو منتشر ہو جاؤ اور وہاں باتوں میں نہ لگے رہو۔ یہ چیز یقیناً نبی کے لیے تکلیف دہ ہے، مگر وہ تم سے (اس کے اظہار پر) شرماتا ہے اور اللہ حق سے نہیں شرماتا۔
>
> اور جب ان (ازواج نبی) سے کوئی چیز مانگو تو پردے کے پیچھے سے مانگا کرو۔
>
> یہ تمہارے اور ان کے دلوں کے لیے زیادہ پاکیزہ ہے۔[7]

وحی میں آگے چل کر حضرت محمدؐ سے کہا گیا کہ آپؐ کی زوجین بیوگی کے بعد دوبارہ شادی نہیں کریں گی اور انہیں جلابیب (جس سے مختلف اوڑھنیاں مراد ہے) اوڑھنے کا واضح الفاظ میں حکم دیا گیا تاکہ بازار میں چلتے وقت بہ آسانی پہچانی جائیں اور کوئی شخص انہیں تنگ نہ کرے۔[8]

حجاب سے متعلق آیات نہایت متنازع بن گئیں۔[9] انجام کار آنحضرتؐ کے وصال سے کوئی

تین پشتوں کے بعد ان کی بنیاد پر تمام عورتوں کو پردے کا پابند کیا گیا اور انہیں گھر کے ایک حصے میں الگ تھلگ رکھنے کا جواز بنایا گیا، لیکن آیات کو سیاق وسباق میں دیکھنا چاہیے۔ یہ سورۃ 33 میں آئی ہیں جہاں محاصرے کے متعلق بھی آرأ موجود ہیں۔ انہیں اس خوفناک پس منظر میں ہی دیکھنا چاہیے۔ یہ احکامات تمام مسلمان عورتوں پر نہیں بلکہ صرف ازواج مطہرات پر عائد ہوتے ہیں۔ ان کی وجہ پیغمبرؐ کے دشمنوں کی سازشیں، آپؐ کی ذاتی زندگی کے متعلق افواہ سازی اور روزمرہ زندگی میں ازواجِ مطہرات کے ساتھ کی جانے والی بدتمیزی تھی۔ محاصرہ کے بعد مدینہ کے زہر خند ماحول نے حضرت محمدؐ کو اپنی نجی زندگی کے انتظامات میں تبدیلیاں لانے پر مجبور کیا۔ تب کے بعد کوئی کھلا گھر نہ بنا؛ اب مسلمانوں کے لیے لازمی تھا کہ وہ حجروں میں براہِ راست داخل ہونے کے بجائے ایک پردے کے پیچھے ہی رہیں۔ لفظ حجاب کا مادہ ''حجب'' یعنی چھپانا ہے۔ پردے نے ایک طرح کی دہلیز بنادی؛ اس نے ازواج کو غلافِ کعبہ کی طرح ملفوف کردیا۔ نازک وقتوں میں عورتوں کے جسم عموماً خطرہ زدہ برادری کی علامت بنے، اور ہمارے اپنے عہد میں بھی حجاب کو مغرب کی جانب سے امت کو لاحق خطرے کے خلاف ڈھال خیال کیا جانے لگا ہے۔

آنحضرتؐ اپنی نجی زندگی کو اپنے معاشرتی فرائض سے جدا نہیں کرنا چاہتے تھے۔ آپؐ نے اپنی زوجین کو عسکری مہمات پر ساتھ لے کر جانا جاری رکھا لیکن اب وہ خیمے میں ہی رہتی تھیں جبکہ امت کی دیگر خواتین نخلستان میں آزادانہ گھومتی پھرتیں۔ حجاب کا مقصد مردوں اور عورتوں کو الگ کرنا نہیں تھا۔ درحقیقت وحی نازل ہونے پر پردہ دو مردوں کے بیچ میں حائل کیا گیا تھا۔۔۔ آنحضرتؐ اور حضرت انسؓ کے درمیان۔۔۔ تاکہ شادی شدہ جوڑے کو بدخواہ لوگوں سے الگ کیا جا سکے۔ حجاب کا آغاز حضرت عمرؓ کی کامیابی تھا جو پیغمبرؐ کو اپنی بیویاں الگ تھلگ رکھنے پر کچھ عرصے سے زور دے رہے تھے۔۔۔ پیچیدہ مسئلے کا ایک ظاہری اور مصنوعی حل۔ آنحضرتؐ لوگوں کے رویے تبدیل کرنا چاہتے تھے اور اس خارجی رکاوٹ کا اطلاق ایک سمجھوتہ تھا۔ کیونکہ اس کے لیے مسلمانوں کو اپنے افعال پر داخلی کنٹرول استعمال کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ لیکن آپؐ نے حضرت عمرؓ کا مطالبہ مان لیا کیونکہ یہ مسئلہ مدینہ کو مشکل میں ڈالے ہوئے تھا۔

مگر صورتحال بہتر نہ ہوئی۔ حجاب متعارف کروائے جانے کے چند ہفتے بعد ہی دشمنانِ پیغمبرؐ نے حضرت عائشہؓ پر ایک مخاصمانہ بہتان باندھا جس نے کافی گڑبڑ پھیلائی اور امت تقسیم ہوتے ہوتے رہ گئی۔ (10) حضرت عائشہؓ ایک آسان ہدف تھیں۔ ہر کوئی جانتا تھا کہ آپؐ آنحضرتؐ کو خصوصی طور پر عزیز ہیں۔ آپؓ خوب صورت، پُر جوش، اور ممتاز حسب نسب کی مالک تھیں اور بلاشبہ بہت سے لوگ آپؓ کے دشمن تھے۔ اس موقعہ پر آنحضرتؐ نے حضرت عائشہؓ کو قریش کے ایک حلیف کے خلاف مہم پر ساتھ لے کر جانے کا فیصلہ کیا۔ مخالف نے قبیلہ معمول کی نسبت مدینہ سے کافی نزدیک خیمہ زن تھا۔ مخبروں نے آنحضرتؐ کو اطلاع دی کہ قریش نے انہیں نخلستان پر حملہ کرنے کو کہا تھا۔ یہ حملہ کامیاب ہوا: مسلمانوں نے ان سے بحیرۂ احمر کے ساحل پر واقع کنواں چھین لیا اور 200 اونٹ، 500 بھیڑیں اور 200 عورتیں بھی ساتھ لے جانے میں کامیاب رہے۔ جویریہؓ بنت الحارث (سردار کی بیٹی) بھی قیدیوں میں شامل تھی۔ اسے دیکھتے ہی حضرت عائشہؓ میں جذبۂ رقابت ابھرا کیونکہ جویریہ نہایت حسین تھیں، اور یقیناً حملے کے بعد ہونے والے مذاکرت کے دوران آنحضرتؐ نے اس کے والد کے ساتھ اتحاد مضبوط بنانے کی خاطر ان کا ہاتھ مانگ لیا۔

مسلمان تین روز تک Muraysi کنوئیں پر خیمہ زن رہے، لیکن غزوہ کے مثبت نتائج کے باوجود مہاجرین وانصار کے مابین عداوت کی سلگتی ہوئی چنگاری نے ایک سنگین صورت اختیار کی۔ مسلمان کنوئیں پر اپنے اونٹوں کو پانی پلا رہے تھے کہ دو مختلف قبائل سے تعلق رکھنے والے مقامی لوگ ایک نہایت بے وقعت بات پر آپس میں لڑنے لگے۔ ایک قبیلہ قریش کا اور دوسرا خزرج کا حلیف تھا۔ کچھ ہی دیر بعد فساد شروع ہو گیا اور متحارب دھڑوں نے قریب کھڑے مسلمانوں سے مدد کرنے کو کہا۔ مہاجرین قریش کے اتحادی لوگوں کی مدد کو دوڑے جبکہ خزرج سے تعلق رکھنے والے انصار نے مدافعت کی راہ اپنائی۔ چند منٹ کے اندر اندر، قرآنی حکم کی عین خلاف ورزی کرتے ہوئے مسلمان آپس میں ہی لڑ رہے تھے۔ حضرت عمرؓ اور کچھ دیگر صحابہ کرامؓ بیچ بچاؤ کرانے آگے بڑھے، لیکن ابن ابیہ غصے میں آ گیا۔ حضرت عمرؓ نے خزرج کو اپنے حلیفوں کی مددگاری سے روکنے کی ہمت کیسے کی! وہ چلایا: ''یہ لوگ ہم پر فوقیت حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ اللہ کی قسم، جب ہم واپس مدینہ جائیں گے تو ہمارے طاقت ور اور بالاتر افراد کمزور اور کمتر لوگوں کو مار بھگائیں گے۔''

قریب کھڑا ایک شخص آنحضرتؐ کو صورت حال کی خبر دینے گیا۔ اس نئی گڑبڑ کی اطلاع ملتے ہی آپؐ بہت ناراض ہوئے۔ حضرت عمرؓ ابیعہ کو فی الفور موت کی سزا دلوانا چاہتا تھا۔ آنحضرتؐ نے تامل کیا: کیا وہ چاہتے تھے کہ لوگ کہیں کہ حضرت محمدؐ نے اپنے ہی؟؟ کو قتل کیا؟[11] آپؐ نے مسلمانوں کو فوراً خیمہ اکھاڑنے اور مدینہ واپس چلنے کا حکم دیا، حالانکہ انہیں دن کی شدید گرمی کے دوران سفر کرنا پڑتا۔ پہلے کبھی ایسا نہ ہوا تھا۔

ایک جگہ پر عارضی قیام کے دوران حضرت عائشہؓ رفع حاجت کی غرض سے پرے گئیں اور واپسی پر اپنے گلے کا ہار غائب پایا۔ یہ ہار انہیں اپنی والدہ سے شادی کا تحفہ ملا تھا اور اس کی گمشدگی انہیں گوارا نہ تھی۔ چنانچہ وہ ہار کی تلاش میں نکل کھڑی ہوئیں۔ جب وہ چلی گئیں تو آدمیوں نے اُن کی حجابی میں ملفوف ڈولی اٹھا کر اونٹ پر رکھی اور انہیں اندر ہی محفوظ خیال کر کے قافلہ روانہ ہو گیا۔ واپس آنے پر حضرت عائشہؓ نے پڑاؤ کی جگہ کو خالی پایا تو زیادہ پریشان نہ ہوئیں، کیونکہ انہیں معلوم تھا کہ جلد یا بدیر کوئی نہ کوئی انہیں ڈھونڈتا ہوا آ جائے گا۔ آپؓ وہیں بیٹھ کر انتظار کرنے لگیں۔ قافلے سے پیچھے رہ گیا صفوان ابن المعطل وہاں پہنچا اور حضرت عائشہؓ کو اونٹ پر سوار کر لیا۔ جب حضرت عائشہؓ المعطل کے ہمراہ دوبارہ قافلے سے آن ملیں تو پرانی افواہ دوبارہ تازہ ہو گئی اور دشمنانِ رسولؐ نے بدترین بہتان باندھے۔ ابن ابیعہ نے آپؐ کے کردار پر کیچڑ اچھالی۔ اس سکینڈل نے مدینہ کو ہلا کر رکھ دیا اور کہانی اس قدر قابلِ فہم معلوم ہوتی تھی کہ کچھ ایک انصار اس پر یقین بھی کر بیٹھے۔ حتیٰ کہ حضرت ابوبکرؓ بھی اپنی بیٹی کے طرف دار نہ رہے۔

آنحضرتؐ نے خود بھی مختلف ممکنات پر غور کیا۔ چند روز تک آپؐ شدید گومگو کی کیفیت میں رہے۔ حضرت عائشہؓ کے لیے آپؐ کی محبت اس قدر شدید تھی کہ انہیں کھونے کا امکان بھی ناقابلِ قبول معلوم ہوا۔ اب آپؐ پر الوہی وحی کا سلسلہ بھی معطل ہو گیا تھا۔ بعثت کے بعد یہ پہلا موقعہ تھا جب الوہی آواز خاموش رہی۔ ابن ابیعہ صورت حال کی خرابی سے فائدہ اٹھاتا رہا اور پرانی قبائلی نفرتیں عود کر آئیں کیونکہ ابن ابیعہ کے قبیلے خزرج نے اوس کے ساتھ لڑائی کی دھمکی دی۔ بنی اوس نے کہا تھا کہ افواہیں پھیلانے والوں کا فوری خاتمہ کر دینا چاہیے۔ صورت حال اس قدر خراب تھی کہ آنحضرتؐ مدینہ کے تمام سرداروں کو ایک میٹنگ میں بلانے اور ان کی مدد مانگنے کو مجبور ہوئے

تا کہ خاندان کے لیے خطرہ بنے ہوئے ابن ابیعہ کے خلاف اقدام کرسکیں۔

انجام کار آنحضرتؐ حضرت عائشہؓ کے پاس گئے جو اپنے والدین کے گھر میں مقیم تھیں۔ وہ دو دن سے رو رہی تھیں لیکن جونہی شوہر نے قدم گھر میں رکھا، ان کے آنسو جادوئی طور پر خشک ہو گئے۔ آنحضرتؐ نے زور دیا کہ وہ اپنا گناہ ایمان داری سے تسلیم کرلیں، توبہ کرنے کی صورت میں اللہ معاف کردے گا۔ لیکن چودہ سالہ حضرت عائشہؓ فخر مندانہ انداز میں سر اٹھا کر کھڑی ہوئیں اور مستحکم لہجے میں جواب دیا۔ انہوں نے کہا کہ یہ سب باتیں نہایت بے بنیاد ہیں، اور وہ کسی ایسی بات کو تسلیم نہیں کرسکتیں جو ان سے سرزد ہی نہیں ہوئی۔ اگر وہ اپنی بے گناہی کا رونا روتیں تو کوئی بھی — حتیٰ کہ والدین بھی — یقین نہ کرتا۔ وہ صرف پیغمبر ایوبؑ کے الفاظ ہی دہرا سکتی تھیں۔ ''نہایت خراب حالات میں صبر و تحمل اللہ کی نظر میں بہترین ہے؛ میں صرف اللہ سے ہی دعا کرتی ہوں کہ وہ مجھے اس بدبختی سے نجات دلائے۔''(12) تب انہوں نے خاموشی سے منہ دوسری طرف کیا اور بستر پہ لیٹ گئیں۔

حضرت محمدؐ اپنی عزیز زوجہ کو اچھی طرح جانتے تھے، کیونکہ ان کی بات ختم ہوتے ہی آپؐ حالتِ وجد میں چلے گئے جو عموماً وحی کے وقت طاری ہوا کرتی تھی۔ آپؐ کو ایک جھپکی آئی اور حضرت ابوبکرؓ نے آپؐ کے سر تلے چمڑے کا تکیہ رکھ دیا۔ حضرت ابوبکرؓ اور ان کی زوجہ بے تابی سے اللہ کے فیصلے کا انتظار کرنے لگے۔ آخر کار آنحضرتؐ نے پکارا: ''اچھی خبر، عائشہؓ!'' اللہ نے انہیں بری کر دیا تھا۔ شکر مند والدین نے حضرت عائشہؓ سے کہا کہ وہ اٹھ کر اپنے شوہر کا شکریہ ادا کریں، مگر وہ وہیں لیٹی رہیں اور جواب دیا: ''میں ان کے پاس جاؤں گی اور نہ ہی شکریہ ادا کروں گی۔ میں آپ دونوں کا بھی شکریہ ادا نہیں کروں گی کیونکہ آپ نے میرے خلاف الزامات سنے اور ان کی تردید نہ کی۔ میں اُٹھ کر صرف اللہ کا شکر ادا کروں گی!''(13) آنحضرتؐ نے اپنی عزیز زوجہ کی اس ضد کو محبت جانا اور باہر جمع ہو جانے والے ہجوم کے سامنے نئی آیات تلاوت فرمائیں۔(14) ایک نجی اور سیاسی بلا ٹل گئی تھی لیکن شکوک موجود رہے۔ اس پریشان کن واقعے نے دکھایا کہ آنحضرتؐ بھی افواہوں کا نشانہ بن سکتے تھے۔ کیا آپؐ کے اثرات ماند پڑنے لگے تھے جیسا کہ ابن ابیعہ نے دعویٰ کیا؟

لیکن 628ء کے ماہ مارچ (ماہ حج) میں آنحضرتؐ نے ایک حیرت انگیز اعلان کیا جو آپؐ کے پیغمبرانہ جینیئس کا غیر معمولی مظاہرہ ثابت ہوا۔[15] لگتا ہے کہ آپؐ کے پاس ابتدا میں کوئی واضح منصوبہ نہیں تھا، بلکہ آپؐ نے ایک عجیب خواب دیکھا: آپؐ حرم مکہ میں منڈے ہوئے سر کے ساتھ اور با احرام کھڑے تھے، آپؐ کے ہاتھ میں کعبۃ اللہ کی کنجیاں تھیں اور انداز قطعی فاتحانہ تھا۔ اگلی صبح آپؐ نے اعلان کیا کہ آپؐ حج کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں اور صحابہ کو بھی ساتھ چلنے کی دعوت دی۔ اس خوف، حیرت اور غیر یقینی مسرت کا اندازہ بہ آسانی لگایا جاسکتا ہے جو یہ حیرت انگیز اعلان سننے والے مسلمانوں میں بھر گئی۔ آنحضرتؐ نے واضح کر دیا تھا کہ یہ ایک عسکری مہم نہیں ہوگی۔ حج کے دوران زائرین کو ہتھیار ساتھ لے جانے کی اجازت نہ تھی اور آپؐ مکہ کی حرمت پائمال کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے تھے جہاں لڑنا منع تھا۔ حضرت عمرؓ نے اعتراض کیا کہ مسلمان قربانی کے جانور بن کر رہ جائیں گے! اپنے دفاع کے قابل رہنا ضروری تھا! لیکن آنحضرتؐ اس پر رضامند نہ ہوئے اور قطعی انداز میں جواب دیا: ''میں اسلحہ ساتھ لے کر نہیں جاؤں گا۔ میں صرف اور صرف حج کرنے جا رہا ہوں۔'' زائرین محض روایتی سفید عبائیں پہنا کرتے تھے؛ سفر کے آغاز میں وہ شکار مارنے کے لیے چھوٹا سا خنجر ساتھ رکھتے تھے، لیکن حالتِ احرام اختیار کرنے کے بعد اس خنجر کو ایک طرف رکھنا پڑتا۔ وہ غیر مسلح ہو کر دشمن کے علاقے میں جاتے۔

آنحضرتؐ کے ساتھ اتحاد میں شامل کوئی بھی بدو یہ خطرہ مول لینے پر آمادہ نہ تھا، لیکن کوئی ایک ہزار مہاجرین و انصار مان گئے۔ حتیٰ کہ ابن ابیعہ اور چند ایک منافقین نے بھی رضامندی ظاہر کی۔ انصار میں سے دو عورتوں — جو بیعت عقبہ کے موقع پر موجود تھیں — کو بھی قافلے میں شامل ہونے کی اجازت ملی، اور آنحضرتؐ کے ساتھ حضرت اُم سلمہؓ تھیں۔

مسلمان اونٹ ساتھ لے کر روانہ ہوئے جنہیں حج کے آخری روز ذبح کرنا تھا۔ پہلے قیام پر آنحضرتؐ نے روایت کے مطابق ان میں سے ایک اونٹ کو مقدس قرار دے کر اس پر خصوصی نشان لگائے، اس کی گردن میں کپڑے لٹکائے اور مکہ کی سمت بھیج دیا۔ تب آپؐ نے ''اللّٰھم لبیک...'' کی صدا بلند کی۔ اس جرأت مندی کی خبر جلد ہی ایک سے دوسرے قبیلے تک پہنچی اور جنوب سے طویل سفر کر کے آنے والے حاجیوں کی طرح بدو بھی پُر شوق انداز میں آگے بڑھتے

رہے۔ آنحضرتؐ جانتے تھے کہ آپؐ نے قریش کو ایک سنگین مشکل سے دوچار کر دیا تھا۔ ہر عرب کو حج کرنے کا حق حاصل تھا، اور اگر حرم کے محافظین، یعنی قریش حرم میں داخلے کے لیے آئے ہوئے ایک ہزار زائرین کو منع کر دیتے تو دیوی کی نظر میں اپنے فرائض سے انحراف کے مرتکب ہوتے۔ آنحضرتؐ کا شہر میں داخل ہو جانا بھی قریش کے لیے ناقابلِ برداشت طور پر باعث تذلیل ہوتا۔ جلد ہی واضح ہو گیا کہ قریش قائدین نے آنحضرتؐ کو ہر قیمت پر روکنے کا تہیہ کر لیا تھا۔ ایک ہنگامی مجلس مشاورت میں خالد بن ولید کو نہتے زائرین پر حملہ کرنے کے لیے دو سو گھوڑ سوار دے کر روانہ کیا گیا۔

یہ خوفناک اور تشویش ناک خبر سن کر آنحضرتؐ اپنے قبیلے پر بہت برہم ہوئے۔ اہلِ قریش جنگ و جدل کی سفاکانہ نفرت کے باعث اس قدر اندھے ہو گئے تھے کہ اب عین انہی مقدس اصولوں کو پائمال کرنے پر تیار تھے جن کی پاسداری ان کی زندگی کا دارومدار تھا۔ رویے میں اس قسم کی تبدیلی کی اصل وجہ کیا تھی؟ آپؐ نے فرمایا، ''افسوس اے قریش! جنگ و جدل نے تمہیں ہڑپ کر لیا! اگر تم مجھے اور باقی کے عربوں کو اپنی راہ پر چھوڑ دو تو تمہارا کیا نقصان ہے؟'' یہ مہم بہت مختلف رنگ اختیار کرنے والی تھی۔ اپنے خواب کی وجہ سے آنحضرتؐ کو توقع تھی کہ انہیں مکہ میں داخل ہونے دیا جائے گا اور آپؐ حج کی پُرامن شرائط کے تحت قریش کو اسلام کے بنیادی اصول بتائیں گے۔ لیکن اب آپؐ واپس نہیں جا سکتے تھے۔ آپؐ نے عزم کیا، ''اللہ کی قسم، میں ہرگز اس فرض کی ادائیگی سے منحرف نہیں ہوں گا جو خدا نے مجھے سونپا ہے، یہاں تک کہ مجھے فتح یا موت نصیب ہو جائے۔[16] آپؐ کے لیے سب سے پہلا کام زائرین کو بحفاظت حرم میں لے جانا تھا۔ مسلمانوں کو دوست بدو قبیلے اسلم سے ایک راہنما مل گیا جو قافلے کو اوپر سے پھرا کر ایسے علاقے میں لے آیا جہاں قتل و غارت حرام تھی۔ اس حرم میں داخل ہوتے ہی آنحضرتؐ نے زائرین کو یاد دہانی کروائی کہ وہ ایک راسخ مذہبی فریضے کی ادائیگی کر رہے تھے؛ ان پر لازم ہے کہ وہ وطن واپسی کا شوق اپنے اوپر غالب نہ آنے دیں۔ لازمی تھا کہ وہ فاتحانہ انداز اپنائیں اور اپنے گناہوں کو پیچھے رکھیں۔ اب انہیں قریبی حدیبیہ کے کنوئیں تک جانا، اپنے اونٹوں کو ریت میں چلنے کے لیے تیار کرنا تھا تا کہ خالد بن ولید اور ان کے ساتھیوں کو معلوم ہو جائے کہ وہ کہاں ہیں۔

حدیبیہ پہنچ کر حضرت محمدؐ کی اونٹنی قصویٰ گھٹنوں کے بل بیٹھ گئی اور آگے جانے سے انکار کر دیا۔ زائرین اس پر چلائے، لیکن آنحضرتؐ نے انہیں ہاتھی کے متعلق یاد دلایا جو برسوں قبل ابائی سینیائی یلغار کے دوران کعبہ کے سامنے جھک گیا تھا۔ ایک الوہی ''شگون'' جس نے دشمن فوج کو لڑائی کیے بغیر واپس چلے جانے پر مائل کیا۔ آج بھی کچھ ویسی ہی صورت حال تھی۔ آپؐ نے وضاحت کی: ''جس نے ہاتھی کو مکہ میں داخل ہونے سے باز رکھا، وہی قصویٰ کو روکے ہوئے ہے۔'' آپؐ نے زائرین کو یہ بھی یاد دلایا کہ وہ صلح کی نیت لے کر آئے تھے: ''قریش نے مجھے اپنے رشتے داروں پر مہربانی کے لیے جو بھی شرط پیش کی، میں قبول کر لوں گا۔''(17) حضرت محمدؐ نے کبھی بھی قریش کا اقتدار ختم کرنے کا منصوبہ نہیں بنایا تھا، بلکہ آپؐ محض سماجی نظام کی اصلاح چاہتے تھے جو شہر کو تباہ کر رہا تھا۔ قریش نے سوچا کہ ان کی زیارت مکہ اعلان جنگ تھی، لیکن آنحضرتؐ مکہ کی تقدیس کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے کا عزم لیے ہوئے تھے۔ جنگ سے کوئی پائیدار فائدہ حاصل نہیں ہوا تھا اور فریقین نے ایک دوسرے کے ساتھ زیادتیاں کی تھیں۔ یہ یلغار کا نہیں بلکہ ایک پُرامن اظہار کا موقعہ تھا۔

لیکن معدودے چند مسلمانوں نے ہی اپنے پیغمبر کی بات کو سنجیدگی سے لیا۔ صورت حال کی ولولہ انگیزی اور ڈرامہ کے باعث وہ کچھ شاندار واقع ہونے کی امید رکھتے تھے۔ شاید کوئی معجزہ ہو جاتا! شاید وہ مکہ میں فاتحانہ داخل ہوتے اور قریش کو شہر سے نکال باہر کرتے! آنحضرتؐ نے پُرسکون انداز میں انہیں اپنے اونٹوں کو پانی پلانے اور اپنے پاس بیٹھنے کا حکم دیا۔ اس موقعہ کو دھرنا (sit-in) کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ شہر میں داخلے کے لیے اجازت ملنے کے منتظر اور تشدد سے مجتنب رہتے ہوئے، آنحضرتؐ ثابت کر رہے تھے کہ آپؐ قریش کی نسبت عرب روایت پر زیادہ کاربند ہیں۔ آپؐ خالی ہاتھ مقدس سرزمین کی جانب جا رہے تھے، جبکہ قریش نے آپؐ پر مسلح حملے کی تیاری کر رکھی تھی۔

اور یقیناً یہ پیغام بدوؤں تک پہنچ گیا۔ مکہ کی زیارت پر آیا ہوا بنوخزاعہ کا ایک سردار اپنے گھوڑے پہ سوار ہو کر حدیبیہ پہنچا تاکہ صورت حال کا جائزہ لے سکے۔ یہ سن کر وہ بہت خوفزدہ ہوا کہ زائرین کو مقدس مقامات تک جانے کی اجازت نہیں دی گئی۔ وہ قریش سے احتجاج کرنے غصے

میں مکہ واپس آ گیا۔ مکہ ہمیشہ سے ایک خصوصی شہر تھا۔ اس نے تمام عربوں کو حرم میں خوش آمدید کہا اوراس کی اجتماعیت پسندی ہی تجارتی کامیابی کا باعث بنی۔ ان کے خیال میں وہ کیا کر رہے تھے؟ انہیں صلح کی نیت سے آنے والے شخص کو روکنے کا کوئی حق نہیں تھا۔ قریش کے بزرگوں نے اس کا مضحکہ اڑایا۔ وہ آنحضرتؐ اور کعبہ کے درمیان حائل ہونے اور آخری دم تک لڑنے کے لیے تیار تھے۔ وہ چلائے ''چاہے وہ جنگ کا ارادہ نہ ہی لے کر آئے ہوں، لیکن اللہ کی قسم وہ ہماری مرضی کے بغیر اندر نہیں آ سکتے، اور نہ ہی عرب کبھی کہیں گے کہ ہم نے انہیں اجازت دی۔''(18)

اس موقعہ پر آنحضرتؐ کے خلاف مکی مدافعت کی قیادت متقی بت پرست سہیل کر رہا تھا۔ آنحضرتؐ کو امید تھی کہ وہ اسلام کی جانب راغب ہو جائے گا۔ اسلام کے اولین مخالفین میں سے چند ایک کے بیٹے بھی آگے آگے تھے: عکرمہ، جو اپنے باپ ابوجہل کی طرح ہر مفاہمت کا مخالف تھا؛ اور صفوان ابن امیہ جس کا باپ بدر میں ہلاک ہوا۔ دلچسپ طور پر، لگتا ہے کہ حدیبیہ کے واقعات میں ابوسفیان نے کوئی کردار ادا نہ کیا۔ اپنی غیر معمولی ذہانت کی بدولت اس نے غالباً محسوس کر لیا تھا کہ آنحضرتؐ نے قریش کو مشکل سے دوچار کر دیا ہے اور اب جاہلیہ کے روایتی انداز میں ان سے نمٹنا ممکن نہیں۔

اہلِ مکہ نے زائرین کو مارنے کی کوشش کی تھی، لیکن آنحضرتؐ ان کی آنکھوں میں دھول جھونک گئے؛ اب انہوں نے مسلمانوں کے درمیان پھوٹ ڈالنے کی خاطر ابن ابیعہ کو کعبہ میں رسوم انجام دینے کی دعوت دی۔ لیکن ابن ابیعہ کے اس جواب نے سب کو حیران کر دیا کہ وہ پیغمبرؐ سے پہلے طواف نہیں کر سکتا۔ آگے چل کر ابیعہ آنحضرتؐ کے ساتھ لڑا، لیکن حدیبیہ میں وہ ایک پُرخلوص مسلمان تھا۔ صفوان اور سہیل نے عکرمہ کو مذاکرات پر مائل کیا اور اپنے ایک بدوی حلیف حلیث (الحارث کا سردار اور نہایت مخلص شخص) کو نمائندہ بنا کر بھیجا۔ جب حضرت محمدؐ نے اسے آتے ہوئے دیکھا تو اس کے استقبال کے لیے قربانی کے اونٹ روانہ کیے اور جب حلیث نے ان جانوروں کو اپنی جانب آتے ہوئے دیکھا تو اس قدر متاثر ہوا کہ آنحضرتؐ سے سوال جواب کرنے کی بجائے فوراً شہر واپس چلا گیا۔ اس نے رپورٹ دی کہ وہاں بے لوث زائرین موجود تھے جنہیں حرم میں داخلے کی فوری اجازت دے دینا چاہیے۔ صفوان بہت غضب ناک ہوا۔ حلیث ـــــ

ایک جاہل بدو — کو احکامات جاری کرنے کی ہمت کیسے ہوئی! یہ ایک سنگین غلطی تھی۔ حلیث اٹھا اور پُر وقار انداز میں جواب دیا:

> اے قریش، ہم نے تمہارے ساتھ اس مقصد کے لیے اتحاد نہیں کیا تھا۔ کیا اللہ کے گھر کی تکریم کے لیے آنے والے شخص کو داخلے سے روکا جائے گا؟ قسم ہے اس کی جس کے قبضے میں میری جان ہے، یا تو تم محمدؐ کو وہ کام کرنے دو جس کے لیے وہ آئے ہیں، یا میں اپنا ایک ایک سپاہی واپس لے جاؤں گا۔[19]

صفوان نے فوراً معذرت کی اور حلیث سے کہا کہ وہ ایک ایسا حل مل جانے تک صبر کرے جو ہر ایک کے لیے تسلی بخش ہو۔

ان کا اگلا ایلچی طائف کا عروہ ابن مسعود مکہ کا ایک اہم حلیف تھا۔ عروہ نے فوراً ایک دکھتی رگ پر ہاتھ رکھا اور آنحضرتؐ سے کہنے لگا، ''تو آپ لوگوں کا یہ ملا جلا ہجوم لے کر اپنے ہی قبیلے کی طاقت کو ختم کرنے واپس آئے ہیں۔ اللہ کی قسم، میں دیکھ سکتا ہوں کہ یہ کل تمہارے ہی خلاف صف آرا ہوں گے!''[20] آنحضرتؐ جانتے تھے کہ طاقت اور اتحاد کے اس مظاہرے کے باوجود آپؐ کے قابلِ اعتبار حلیف چند ایک ہی تھے۔ زیارت کعبہ پر ساتھ چلنے سے انکار کر دینے والے بدو اتحادیوں کا اسلام محض بناوٹی تھا؛ مدینہ میں مسلمانوں کی حیثیت ابھی تک غیر محفوظ تھی؛ اور آپ جانتے تھے کہ کچھ قریب ترین ساتھی بھی آپؐ کے آئندہ اقدام کی تفہیم نہیں رکھتے۔ آپؐ حقیقی بنیادوں پر قریش یعنی اپنے ہی قبیلے سے کیسے ٹکر لیتے؟ دوسری طرف قریش مستحکم انداز میں متحد، پوری طرح مسلح تھے۔ عروہ نے بتایا کہ قریش کی عورتوں اور بچوں نے بھی آپؐ کو مکہ میں داخلے سے باز رکھنے کا حلف دیا ہے۔ بایں ہمہ، عروہ اس بحران کے دوران پیغمبرؐ اسلام کے ساتھ مسلمانوں کی وابستگی سے متاثر ہوا اور اس نے قریش کو بتایا کہ — کم از کم فی الوقت — حضرت محمدؐ جیتنے والے پتوں کے مالک تھے اور انہیں آپؐ کے ساتھ کوئی سمجھوتہ کرنا ہوگا۔

آنحضرتؐ نے اپنا ایک سفیر مکہ بھجوانے کا فیصلہ کیا۔ پہلے آپؐ نے انصار میں سے ایک کو بھیجا

کیونکہ آپؐ کا خیال تھا کہ یہ کم باعث اشتعال ہوگا، لیکن قریش نے اس کا اونٹ پکڑ لیا، اور اگر حلیث کے قبیلے والے مداخلت نہ کرتے تو وہ اسے مار ہی ڈالتے۔ اس کے بعد آنخضرتؐ نے حضرت عمرؓ سے رابطہ کیا، لیکن شہر میں ان کے قبیلے والوں میں سے کوئی بھی انہیں تحفظ دینے کے قابل نہ تھا۔ چنانچہ بارسوخ حضرت عثمانؓ بن عفان کو یہ مشن سونپنے کا فیصلہ ہوا۔ قریش نے ان کی بات سنی لیکن اسلام کی تشریح کے قائل نہ ہو سکے۔ البتہ انہوں نے حضرت عثمانؓ کو رسوم حج انجام دینے کی اجازت دی۔ یقیناً حضرت عثمانؓ نے ایسا کرنے سے انکار کیا جس پر قریش نے انہیں بطور یرغمال اپنے پاس رکھنے کا فیصلہ کیا، لیکن مسلمانوں کو اطلاع بھجوائی کہ عثمانؓ کو ہلاک کر دیا گیا۔

یہ ایک خطرناک موڑ تھا۔ یوں لگا کہ جیسے مہم کے غبارے سے ساری ہوا نکل گئی ہو۔ اس نہایت کشیدہ صورت حال میں آنخضرتؐ حالتِ وجد میں چلے گئے، لیکن اس مرتبہ اللہ کی جانب سے کوئی وحی نہ آئی اور آپؐ نے غور و خوض کے بعد آئندہ کی حکمتِ عملی طے کی۔ انجام کار آپؐ نے زائرین سے حلف وفاداری دینے کو کہا۔ آپؐ نے باری باری ہر ایک کا ہاتھ پکڑا اور حلف لیا۔ تمام مستند کتب میں اس واقعے کی تفسیر مختلف طور پر کی گئی ہے، لیکن واقدی کا بیان سب سے زیادہ قائل کر لینے والا لگتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ مسلمانوں نے آنخضرتؐ کی اطاعت کرنے اور بحران کے دوران آپؐ کی پیروی کرنے کی قسم کھائی۔[21] آنخضرتؐ اپنے ساتھیوں کو کبھی بھی مطلق طور پر فرماں بردار نہیں بنا پائے تھے، لیکن حضرت عثمانؓ کی ہلاکت کی خبر سے لرزہ براندام ابن ابیعہ اور منافقین بھی حلف اٹھانے کو تیار تھے۔ آنخضرتؐ نے عمیق جبلتی سطح پر ایک راہ عمل اپنانے کا تہیہ کیا جو متعدد افراد کے لیے ناقابلِ قبول تھی۔ آپؐ پیشگی استقرار، وفاداری چاہتے تھے۔ سب لوگ حلف لے چکے تو معاملات کچھ بہتر ہونا شروع ہوئے۔ سب سے پہلے خبر آئی کہ حضرت عثمانؓ زندہ ہیں، اور پھر آنخضرتؐ نے سہیل کو اپنے پڑاؤ کی جانب آتے دیکھا۔ تب آپؐ کو محسوس ہوا کہ قریش مذاکرات کے لیے سنجیدگی سے تیار تھے۔

یہ بذاتِ خود ایک اہم کامیابی تھی۔ آخر کار آنخضرتؐ نے قریش کو اپنے بارے میں سنجیدہ رویہ اپنانے پر مجبور کر دیا تھا اور پُرامن حل کا ایک حقیقی امکان موجود تھا۔ حضرت محمدؐ کافی دیر تک سہیل کے ساتھ بیٹھے رہے، لیکن طے پانے والی شرائط نے آپؐ کے بہت سے صحابہ کو سخت مایوس کیا۔

پہلے آپؐ نے وعدہ کیا کہ حرم کی زیارت کیے بغیر مدینہ واپس چلے جائیں گے، البتہ سہیل نے وعدہ کیا کہ آیندہ برس مسلمانوں کو آنے اور شہر کی حدود کے اندر رسومِ حج ادا کرنے کی اجازت ہوگی۔ مکہ اور مدینہ دس برس تک آپس میں جنگ نہیں کریں گے؛ آنحضرتؐ نے وعدہ کیا کہ اسلام قبول کرنے اور اپنے سرپرستوں کی مرضی کے بغیر ہجرت کر کے مدینہ جانے والے کسی بھی قریش کو واپس بھیج دیا جائے گا، لیکن یہ رضامندی بھی دی کہ مکہ کے ساتھ مل جانے والے کسی بھی مسلمان کو قریش واپس نہیں بھجوائیں گے۔ بدو قبائل اپنے سابقہ معاہدے کی شرائط سے آزاد ہو گئے اور اب مرضی کے مطابق مدینہ یا مکہ کے ساتھ اتحاد کر سکتے تھے۔

قرآن نے کافی پہلے قرار دیا تھا کہ امن کی خاطر مسلمانوں کے لیے لازم ہے کہ وہ دشمن کی پیش کردہ کوئی بھی تجاویز مان لیں، چاہے وہ نقصان دہ ہی کیوں نہ لگتی ہوں۔[22] مگر بہت سے زائرین نے ان شرائط کو باعثِ بے عزتی خیال کیا۔ معاہدۂ جنگ بندی کا مطلب تھا کہ اب مسلمان مکی تجارتی قافلوں پر حملہ نہیں کر سکیں گے۔ آخر آنحضرتؐ نے اس اقتصادی رکاوٹ کو ہٹانے پر رضامندی کیوں دی جو اپنا کام دکھانے لگی تھی؟ آپؐ نومسلموں کو واپس مکہ بھجوانے پر کیوں مان گئے، حالانکہ قریش جواب میں ایسا ہی کرنے کے پابند نہ تھے؟ گزشتہ پانچ برس کے دوران مسلمانوں نے اپنے مذہب کی خاطر جان دی تھی؛ دیگر نے اپنا سب کچھ اور اہلِ خانہ کو بھی داؤ پر لگایا تھا۔ اس کے باوجود آنحضرتؐ نے بڑے تحمل کے ساتھ قریش کی بالادستی دوبارہ قائم کر دی اور کہا کہ زائرین خاموشی سے گھر واپس چلے جائیں گے۔ یہ معاہدہ ہر لحاظ سے جاہلی جبلت کے خلاف تھا۔ ابن اسحٰق نے وضاحت کی: ''پیغمبرؐ اسلام کے صحابہ مکہ پر قبضے پر کوئی شک کیے بغیر گھر سے روانہ ہوئے تھے کیونکہ آنحضرتؐ کو خواب میں بشارت دی گئی تھی۔ جب انہوں نے امن مذاکرات اور پھر واپسی عمل میں آتے دیکھی تو بہت رنجیدہ اور مایوس ہوئے۔''

فضا میں سرکشی تھی۔ اس ساری خطرناک مہم کے دوران زائرین کو باندھے رکھنے والے بندھن ٹوٹ گئے اور امت کے اندر پھوٹ کی علامات ظاہر ہوئیں جو ہمیشہ سے موجود تھیں۔ حضرت عمرؓ حضرت ابوبکرؓ کے پاس گئے اور کہا، ''کیا ہم مسلمان اور وہ مشرک نہیں ہیں؟ ہم ایسی بات پر رضامند کیوں ہوں جس میں ہمارے مذہب کی بے توقیری ہوتی ہے؟''[24] حضرت ابوبکرؓ بھی

پریشان تھے، لیکن انہوں نے جواب دیا کہ تمام باتوں کو باوجود وہ اب بھی پیغمبر پر ایمان رکھتے تھے۔ بعد میں حضرت عمرؓ نے کہا کہ اگر انہیں ایک سو ساتھی بھی مل جاتے تو وہ علیحدگی اختیار کر لیتے۔ اس موقعہ پر وہ آنحضرتؐ کے رویا کی تفہیم نہیں رکھتے تھے۔[25] بہت سے مدنی مسلمانوں اور محروم قریش قبیلچوں سے تعلق رکھنے والے مہاجرین کی طرح وہ محض مکہ کے سماجی اسلام کی اصلاح نہیں بلکہ اسے اکھیڑ پھینکنا اور اس کی جگہ ایک خالص قرآنی حکومت لانا چاہتے تھے۔ حضرت عمرؓ باہمت، بے لوث اور انصاف و مساوات کے مثالی تصورات سے عقیدت رکھتے تھے جن کا مکی لوگوں میں فقدان تھا۔ لیکن آپؐ کافی تیز مزاج بھی واقع ہوئے تھے۔ اس وقت تک آپؓ نے یہ نہیں سمجھا تھا کہ حلم اور عدم تشدد کی اقدار بھی اسلامی مثالی تصور کا محور تھیں۔ وہ عملی شخص تھے اور معاملات پر غور و فکر کیے بغیر تلوار نکال لیا کرتے تھے۔[26] حدیبیہ میں آنحضرتؐ کی حکمتِ عملی دیکھ کر وہ حیرت اور گڑبڑاہٹ کا شکار ہوئے۔

غزوۂ خندق میں قریش کو شکست دینے کے بعد بدیہی طریقہ کار دباؤ بڑھانا اور انہیں تباہ کر دینا ہونا چاہیے تھا، لیکن آنحضرتؐ نے ایسا کرنے کا کبھی بھی ارادہ نہیں کیا تھا۔ مکہ کی شکست عرب کے لیے ایک ناقابلِ تصور آفت ہوتی۔ اس پسماندہ خطے کو قریش کے تجارتی جینیئس کی اشد ضرورت تھی۔ اقتصادی بندش ختم کر کے آنحضرتؐ ان کے دل جیتنا چاہتے تھے۔ آپؐ حدیبیہ میں موجود کسی بھی شخص سے زیادہ دور اندیش تھے۔ کمزور بن کر کہیں بیٹھے رہنے کی بجائے آپؐ کو بخوبی علم تھا کہ کیا کرنا ہے اور کیا نہیں۔ آپؐ عربوں کے لیے ایک بے مثال سیاسی اور مذہبی حل کی جانب بڑھ رہے تھے، اور اس کا مطلب تھا کہ آپؐ کوئی متوقع اقدام نہیں کر سکتے تھے، کیونکہ اس طرح ناخوش گوار صورت حال آپ کی نظر سے اوجھل ہو جاتی۔

جب آپؐ نے عازمین حج کے چہروں پر حیرت اور دکھ کے آثار دیکھے تو انہیں بتایا کہ معاہدے کی شرائط تسلیم کر لینا ضروری ہے کیونکہ یہ منجانب اللہ ہیں۔ سبھی مسلمان اس توجیہہ پر مطمئن نہ ہوئے۔ انہیں کسی قسم کے معجزے کی امید تھی اور یہ چیز منافقین کے لیے بھی شدید مایوسی کا باعث تھی جو محض دنیوی فائدے کی خاطر امت کے ساتھ آن ملے تھے۔ اس وقت صورت حال اور بھی کشیدہ ہو گئی جب مسلمانوں نے معاہدے کے الفاظ سنے۔ آنحضرتؐ نے حضرت علیؓ کو معاہدہ لکھنے کے

لیے بلوایا اور جب انہوں نے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے آغاز کیا تو سہیل نے اعتراض کیا۔ قریش نے ہمیشہ ان اوصاف کو اللہ کے لیے کچھ کمزور خیال کیا تھا۔ چنانچہ سہیل نے اصرار کیا کہ "اے اللہ! تیرے نام سے" کے ساتھ آغاز کیا جائے۔ آنحضرتؐ نے فوراً رضامندی ظاہر کر دی جس پر مسلمان بہت مایوس ہوئے۔ ابھی مزید حیرت انگیز مراحل باقی تھے کہ آنحضرتؐ نے لکھوانا جاری رکھا: "یہ معاہدہ اللہ کے پیغمبر محمدؐ اور سہیل ابن عمرو کے درمیان طے پایا ہے۔" سہیل نے دوبارہ قطع کلامی کی۔ اس نے کہا کہ اگر وہ حضرت محمدؐ کو رسول اللہ مان لیتا تو ان تمام برسوں کے دوران ان کے خلاف لڑا نہ ہوتا۔ اس نے کہا کہ آنحضرتؐ صرف اپنا نام اور اپنے والد کا نام ہی لکھیں۔ حضرت علیؓ رسول اللہ کے الفاظ لکھ چکے تھے۔ انہوں نے آنحضرتؐ سے کہا کہ وہ ان الفاظ کو کاٹنے کی ہمت نہیں رکھتے۔ چنانچہ آنحضرتؐ نے قلم کے لیے ہاتھ آگے بڑھایا اور حضرت علیؓ سے کہا کہ وہ الفاظ کی طرف اشارہ کریں۔ حضرت علیؓ نے ایسا ہی کیا اور آنحضرتؐ نے اپنے ہاتھ سے انہیں کاٹ دیا۔ اب عبارت یوں ہوگئی "یہ معاہدہ محمد بن عبداللہ نے سہیل بن عمرو کے ساتھ طے کیا ہے۔"(27)

معاہدے پر دستخط کرنے کے نہایت کٹھن موڑ پر سہیل کا بیٹا ابوجندل ایک دم وہاں آ گیا۔ اس نے اسلام قبول کر لیا تھا، لیکن سہیل نے اسے گھر میں بند کر رکھا تھا تاکہ وہ ہجرت کر کے مدینہ نہ جا سکے۔ تاہم، اب وہ کسی طرح بھاگ نکلے اور سلاسل گھسیٹتے ہوئے حدیبیہ میں مسلمانوں سے آ ملے۔ سہیل نے اپنے بیٹے کو ایک طمانچہ رسید کیا، اس کی زنجیریں پکڑیں اور حضرت محمدؐ کی جانب مڑا۔ کیا وہ اپنے الفاظ پر قائم رہیں گے اور اس مفرور کو جائز سرپرست کے حوالے کر دیں گے؟ آنحضرتؐ اپنے وعدے سے پھرنے والے نہیں تھے، حالانکہ ابوجندل چیخے چلائے۔ سہیل انہیں گھسیٹتا ہوا واپس مکہ لے گیا۔ "اے مسلمانو! کیا مجھے واپس مشرکین کے حوالے کیا جا رہا ہے تاکہ وہ مجھے میرے مذہب سے الگ کر دیں؟" ابن اسحٰق نے کلاسیکی سمجھ داری سے تبصرہ کیا: "اس چیز نے لوگوں کا حوصلہ مزید پست کر دیا۔"(28)

حضرت عمرؓ کا پیمانۂ صبر چھلک گیا۔ وہ ایک مرتبہ پھر کھڑے ہوئے اور فرمایا: کیا وہ اللہ کے پیغمبر نہیں؟ کیا مسلمان راستی پر اور ان کے دشمن غلطی پر نہیں؟ کیا آنحضرتؐ نے انہیں یقین نہیں

دلایا تھا کہ وہ دوبارہ کعبہ میں عبادت کریں گے؟ یہ سب باتیں درست تھیں۔ آنحضرتؐ نے دھیمے لہجے میں فرمایا کہ کیا آپؐ نے ان سے اسی سال حرم میں واپسی کا وعدہ کیا تھا؟ حضرت عمرؓ خاموش ہو گئے۔ تب حضرت محمدؐ نے مضبوط لہجے میں کہا: ''میں اللہ کا پیغمبر ہوں۔ میں اس کے احکامات کی خلاف ورزی نہیں کروں گا اور وہ مجھے شکست نہیں ہونے دے گا۔''[29] شدید پریشان ہونے کے باوجود حضرت عمرؓ پُرسکون ہو گئے اور معاہدے میں شرکت کی۔ لیکن عازمین ابھی تک غضبناک تھے، اور ایک موقعہ پر تو ان کی بغاوت کا خطرہ بھی پیدا ہو گیا۔ آنحضرتؐ نے اعلان فرمایا کہ اگرچہ وہ کعبہ تک نہیں پہنچے، لیکن وہیں حدیبیہ میں حج مکمل کر لیں: مسلمانوں کے لیے ضروری تھا کہ وہ سر منڈوائیں اور اپنے اونٹ قربان کریں، جیسا کہ انہوں نے مکہ کے قلب میں کرنا تھا۔ سنگین خاموشی چھا گئی، اور عازمین نے پریشان نگاہوں سے آنحضرتؐ کی طرف دیکھا— کہ جیسے یہ بات انہیں پسند نہ آئی ہو۔ آنحضرتؐ اپنے خیمے میں واپس تشریف لے گئے۔ آپؐ کرتے تو کیا کرتے؟ آپؐ نے ام سلمہؓ سے مشورہ کیا۔ انہوں نے مسئلے کا انداز بالکل درست انداز میں پیش کیا— آنحضرتؐ باہر جائیں اور کچھ کہے بغیر اونٹ اللہ کی راہ میں قربان کر دیں۔ یہ بالکل درست فیصلہ تھا۔ خون بہنے کے منظر نے مایوسی کی چادر پھاڑ ڈالی اور مسلمان فوراً اپنے اپنے جانور ذبح کرنے اور سر منڈوانے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔ بعد ازاں حضرت ام سلمہؓ نے ان کا جوش و خروش بیان کرتے ہوئے کہا کہ ''مجھے خدشہ محسوس ہوا کہ کہیں وہ اس جوش میں خود کو زخمی ہی نہ کر بیٹھیں۔''

عازمین نسبتاً مطمئن دلوں کے ساتھ گھر واپس چل دیے، لیکن کچھ غصہ موجود رہا اور آنحضرتؐ خود بھی سوچوں میں گم معلوم ہوتے تھے۔ حضرت عمرؓ کو خوف تھا کہ ان کی سرکشی نے دوستی کو ناقابلِ تلافی نقصان نہ پہنچا دیا ہو! جب انہیں قافلے کے قائد گروپ میں شامل ہونے کا بلاوا بھیجا گیا تو ان کا دل ڈوبنے لگا، لیکن آنحضرتؐ کا دمکتا ہوا چہرہ دیکھ کر ان کی ڈھارس بندھی، کہ جیسے ان کے کندھوں سے بہت بڑا بوجھ اتر گیا ہو۔ آپؐ نے حضرت عمرؓ سے ارشاد کیا:[30] ''مجھ پر ایک سورۃ نازل ہوئی ہے جو مجھے اس دنیا کی کسی بھی چیز سے زیادہ پیاری ہے۔'' یہ سورۃ الفاتحہ تھی۔ اس نے حدیبیہ کے واقعات کے عمیق تر معانی منکشف کیے اور ایک شاندار یقین دہانی کے ساتھ آغاز کیا کہ وہاں آنحضرتؐ کو ایک سفارتی شکست نہیں ہوئی تھی، بلکہ خدا نے انہیں ایک 'واضح فتح' عطا

فرمائی تھی۔ انہوں نے اپنا سکینہ (امن و آشتی کا جذبہ) پھیلایا تھا جو مسلمانوں کے دلوں میں سرایت کر گیا۔ مسلمانوں نے آنحضرتؐ کے ہمراہ آ کر بے مثال جرأت مندی کا مظاہرہ کیا تھا۔ ایک عزمِ صمیم کا اظہار جس سے بدو ناواقف تھے۔ انہوں نے اپنا ایمان اور بھروسہ ایک مرتبہ پھر عیاں کرتے ہوئے اللہ کی خوشنودی کا حلف لیا تھا۔ نیز، مکہ کے ساتھ آنحضرتؐ کا کیا ہوا سمجھوتہ ایک آیۃ (نشانی) تھا جس نے خدا کی موجودگی کو آشکار کیا۔

حدیبیہ کے مقام پر فتح نے مسلمانوں کو قریش سے ممیّز کر دیا جنہوں نے اپنے رویے سے ظاہر کیا تھا کہ وہ اب بھی جاہلی گھمنڈ اور ہٹ دھرمی کے بوجھ تلے دبے ہوئے ہیں۔ یہ ہٹ دھرمی ان کی غیرت یا روایتی انداز حیات کے لیے نقصان دہ تھی۔ حتیٰ کہ وہ غیر مسلح عازمین حرم میں داخلے کی اجازت دینے کی ''توہین'' برداشت کرنے کے بجائے انہیں مار ڈالنے کو تیار تھے۔

> جب وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا، اپنے دلوں میں غیرت کا یعنی جاہلانہ غیر کا مسئلہ بنا بیٹھے تو اللہ نے اپنے رسول پر اور مومنوں پر اپنی سکینت اتاری اور انہیں تقویٰ کے کلمہ پر قائم رکھا اور وہی اس کے سب سے زیادہ حق دار اور اہل تھے۔ اور اللہ ہر چیز کو خوب جانتا ہے۔[31]

مسلمانوں سے توقع نہیں کی جاتی تھی کہ وہ جنگجوئی رویہ اختیار کریں گے! وہ حلم، امن اور برداشت کے جذبے سے متصف تھے جس نے انہیں اہل الکتاب یعنی یہودیوں اور عیسائیوں کا حلیف بنایا۔ اللہ کے حقیقی پیروکاروں نے حدیبیہ میں قریش جیسا جارحانہ رویہ اختیار کرنے کی بجائے اللہ کے سامنے سر جھکایا اور دعا مانگی:

> تو انہیں رکوع کرتے ہوئے اور سجدہ کرتے ہوئے دیکھے گا۔ وہ اللہ ہی سے فضل اور رضا چاہتے ہیں۔ سجدوں کے اثر سے ان کے چہروں پر ان کی اضافی نشانی ہے۔ یہ ان کی مثال ہے جو تورات میں ہے۔

تشدد اور دھونس نے نہیں بلکہ رحم، خوش اخلاقی اور تحمل کے جذبے نے امت کو فروغ دیا، ''اس کھیتی کی طرح جو اپنی کونپل نکالے پھر اسے مضبوط کرے پھر وہ موٹی ہو جائے اور اپنے ڈنٹھل پر کھڑی ہو جائے، کاشتکاروں کو خوش کر دے۔''(32) جنگ ختم ہو گئی تھی۔ اب مقدس امن کا دور آیا۔

درحقیقت کشمکش جاری رہی، لیکن تاریخی ماخذوں کا اتفاق ہے کہ حدیبیہ نے امن قائم کر دیا تھا۔ ابن اسحٰق کو یقین تھا کہ ''معاہدۂ جنگ بندی شروع میں غیر خوش کن لگا، لیکن اس نے اسلام کے لیے دروازے کھول دیے۔'' اب سے پہلے تک کوئی بھی شخص متواتر لڑائی اور بڑھتی ہوئی نفرت کے باعث آرام سے بیٹھ کر نئے مذہب پر گفتگو کے قابل نہیں ہو پایا تھا، لیکن اب ''جنگ بندی ہوئی اور لوگ بحفاظت آپس میں ملے اور اسلام پر غور و خوض کیا۔'' درحقیقت 628ء اور 630ء کے درمیان اس سے دوگنے یا زائد لوگ مسلمان ہوئے جتنے احیائے اسلام سے لے کر تب تک ہوئے تھے۔''(33) مختصر غنائی سورۃ النصر (''مدد'') غالباً اسی دور سے تعلق رکھتی ہے:

جب اللہ کی مدد اور فتح آئے گی
اور تو لوگوں کو دیکھے گا کہ
وہ اللہ کے دین میں فوج در فوج داخل ہو رہے ہیں۔
پس اپنے رب کی حمد کے ساتھ
تسبیح کر اور اس سے مغفرت مانگ،
یقیناً وہ بہت توبہ قبول کرنے والا ہے۔(34)

کوئی جشنِ فتح، انتقام کے لیے کوئی پکار نہیں ہونی چاہیے تھی۔ نئے عہد کو تشکر، عفو و درگزر اور مسلمانوں کی جانب سے استغفار کا حامل ہونا چاہیے تھا۔

حدیبیہ نے بحیثیت مجموعی جزیرہ نما میں اسلام کی حیثیت کو بہتر بنایا ہوگا، لیکن دیگر پیش رفت کی طرح اس نے مدینہ میں موجود آنحضرتؐ کو بہت کم مدد دی۔ بہت سے عازمین — انصار و ... بدستور خود کو فریب زدہ محسوس کرتے رہے۔ مہاجرین نے پوچھا کہ اگر اب ... تجارتی

قافلوں پر حملے نہ کر سکے تو اپنا پیٹ کیسے پالیں گے؟ آنحضرتؐ جانتے تھے کہ آپؐ اس بے چینی کو بڑھنے کی اجازت نہیں دے سکتے۔ آپؐ کو کوئی نہ کوئی ایسی راہ تلاش کرنی تھی کہ معاہدے کی خلاف ورزی کیے بغیر انہیں روزی مہیا کر سکیں۔ لہٰذا حدیبیہ کے بعد آپؐ نے مسلمانوں کی توجہ مکہ سے پرے شمال کی جانب مبذول کروائی۔ جلاوطن کردہ یہودی قبیلے بنونضیر کا نیا وطن خیبر ابھی تک باعثِ خطر تھا۔ بستی کے قائدین نے شمالی قبائل میں آنحضرتؐ کے خلاف دشمنی کے جذبات کو فروغ دینا جاری رکھا۔ چنانچہ حدیبیہ سے واپسی کے کچھ ہی عرصے بعد وہ چھ سو افراد پر مشتمل ایک فوج لے کر شہر کا محاصرہ کرنے روانہ ہو گئے۔ قریش یہ خبر سن کر بہت مسرور ہوئے، کیونکہ انہیں یقین تھا کہ مسلمانوں کو شکست ہو گی۔

مدینہ کی طرح آتش فشانی چٹانوں میں گھرے ہوئے میدانوں والا خیبر ناقابلِ شکست خیال کیا جاتا تھا؛ لیکن مسلمان اُس قبائلی منافرت سے فائدہ اٹھانے کے قابل ہوئے جو خیبر میں قبائلی جذبے کے انحطاط کا اشارہ تھی (جیسا کہ مدینہ میں بھی ہوا تھا)۔ خیبر کا ہر قبیلہ خود مختار تھا، اور انہوں نے محاصرے کے دوران مؤثر طور پر اپنا دفاع کرنا مشکل پایا۔ مزید مشکل یہ ہوئی کہ غطفان کے قبائل ــــ جن کی جانب سے مددِ ملنے کی انہیں امید تھی ــــ وقت پر نہ پہنچ سکے۔ چنانچہ کوئی ایک ماہ بعد یہودیوں کے بزرگوں نے امن کی درخواست کی اور مدینہ کے باجگزار بن گئے۔ معاہدے پر مہر ثبت کرنے کی خاطر آنحضرتؐ نے اپنے پرانے دشمن Huyay (نضیر کا سردار) کی بیٹی کو اپنی بیوی بنا لیا۔ سترہ سالہ خوب صورت دوشیزہ حضرت صفیہ اسلام میں بخوشی داخل نہ ہوئی تھیں، اور آنحضرتؐ نے سخت احکامات جاری کیے کہ ان کے والد کے متعلق کوئی برے کلمات نہ کہے جائیں جو محاصرے کے دوران ہلاک ہو گیا تھا۔ آپؐ نے حضرت صفیہؓ کو بتایا کہ اگر سابقہ بیویوں میں سے کوئی انہیں یہودی نسل سے ہونے کا طعنہ دیں تو انہیں جواب دیں: ''میرا باپ ہارون اور موسیٰ میرا چچا ہے۔''[35] اس شادی نے مصالحت اور درگزر کا رویہ ظاہر کیا جسے فروغ دینا آپؐ کا مشن تھا۔ اب ماضی کی نفرت اور خونریزی سے حذر کرنے کا وقت تھا۔

خیبر سے واپسی پر آپؐ گھر والوں سے دوبارہ مل کر بہت خوش ہوئے۔ حدیبیہ کے بعد آپؐ نے تب تک ابائی سینیا میں ہی مقیم جلاوطن مسلمانوں کو ایک پیغام بھیجا اور انہیں واپس آنے کی

دعوت دی، کیونکہ عرب میں حالات بہتر ہو گئے تھے۔ اور جب آپؐ گھر پہنچے تو آپؐ کے چچا زاد بھائی جعفر بن ابو طالب (جن کے ساتھ تیرہ سال سے ملاقات نہیں ہوئی تھی) مدینہ میں آپؐ کے منتظر تھے۔ اس سال کے شروع میں آپؐ کو خبر ملی تھی کہ آپؐ کا کزن عبیداللہ ابن جحش ابائی سینیا میں فوت ہو گیا تھا۔ آپؐ نے اس کی بیوہ رملہؓ سے شادی کا فیصلہ کیا جو ام حبیبہؓ کی کنیت سے جانی جاتی ہیں۔ شادی کی تقریب نجاشی (Negus) کے سامنے ولی کے ذریعے انجام پائی، اور مسجد میں ان کے لیے ایک حجرہ پہلے ہی تیار کیا جا چکا تھا۔ یہ ایک اور ذہین سیاسی حکمتِ عملی تھی، کیونکہ اُمِ حبیبہؓ اصل میں ابوسفیان کی بیٹی تھیں۔

باقی کا سال معمول کی مہمات میں گزرا جن میں سے کچھ شمال کے نئے یہودی اتحادیوں کی درخواست پر کی گئیں۔ تب مارچ 629ء کے ماہ حج میں کعبہ کی ایک اور زیارت کا موقعہ آیا۔ اس مرتبہ 2,600 عازمین آپؐ کے ہمراہ تھے۔ جب وہ حرم کے قریب پہنچے تو قریش نے وعدے کے مطابق شہر خالی کر دیا۔ قریش بزرگوں نے آنحضرتؐ کو ایک قریبی پہاڑ کی چوٹی سے نیچے اترتے دیکھا۔ مسلمانوں کی آواز نے ان کی موجودگی کا اعلان کیا: ''**اللّٰھم لبیک**......!'' کی صدا وادیوں اور شہر کی خالی گلیوں میں گونجی ہو گی۔ لیکن قریش یقیناً مسلمانوں کے منظّم انداز سے بھی متاثر ہوئے ہوں گے۔ بے مہار خوشی یا بے لگام جشن کے کوئی مناظر دیکھنے میں نہ آئے۔ اس کی بجائے زائرین کا ایک انبوہِ کثیر شہر میں آہستہ آہستہ آگے بڑھا۔ آنحضرتؐ اپنی قصویٰ پہ سوار ہو کر قیادت فرما رہے تھے۔ کعبہ پہنچ کر آپؐ اترے اور حجر اسود کو بوسہ دیا، چھاتی سے لگایا اور پھر طواف کرنے چل دیے۔ زائرین کے جلوس نے بھی تقلید کی۔ یہ ایک انوکھی وطن واپسی تھی۔ مہاجرین ضرور اپنی واپسی کے باعث مغلوب از جذبات ہوئے ہوں گے، لیکن خالی پڑے شہر میں بھی انہیں من مانی کرنے کی اجازت نہ تھی۔ حدیبیہ میں طے پا چکا تھا کہ اِس سال مسلمان حج اکبر کی بجائے عمرہ ہی کریں گے جس میں کوہِ عرفات پر اور وادیٔ منیٰ میں جانا شامل نہیں۔

اپنی عارضی شہر بدری کے دوران قریش نے سابق غلام حضرت بلالؓ کو کعبہ کی چھت پہ چڑھ کر اذان دیتے ہوئے دیکھنا ناپسند کیا ہو گا۔ یہ بلند آہنگ آواز دن میں تین مرتبہ وادی میں گونجی اور

"اللہ اکبر" کی پکار کے ذریعے مسلمانوں کو صلوٰۃ کے لیے بلایا۔ اللہ اکبر کی صدا اس امر کی یاد دہانی تھی کہ اللہ حرم کے تمام بتوں سے برتر ہے جو اس رسوماتی تذلیل کا تدارک کرنے کے لیے کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ یہ آنحضرتؐ کی ایک زبردست فتح تھی، اور متعدد نوجوان قریش اپنے پرانے مذہب کی بدنصیبی کے اور بھی زیادہ قائل ہو گئے۔

شہر میں قیام کی آخری رات کو آنحضرتؐ اپنے چچا حضرت عباسؓ سے بھی ملے جو ابھی تک پرانے مذہب کے پیروکار تھے۔ انہوں نے آپؐ کو اپنی بہن میمونہؓ کا ہاتھ پیش کیا جو حال ہی میں بیوہ ہوئی تھیں۔ آنحضرتؐ نے یہ رشتہ بخوشی قبول فرمایا اور قریش کو بھی شادی میں شرکت کی دعوت بھیجی۔ قریش کا پیمانہ لبریز ہونے لگا اور سہیل نے آکر آپؐ کو مطلع کیا کہ شہر میں تین روزہ قیام کی مدت پوری ہو گئی تھی، اس لیے اب انہیں فوراً واپس چلے جانا چاہیے۔ خزرج کا سردار اور آنحضرتؐ کا ہمراہی سعد ابن عبادہ اس بد اخلاقی پر بہت غضبناک ہوا، لیکن آپؐ نے اسے فوراً خاموش کروا دیا: "اے سعد! اس شخص کے ساتھ غلط انداز میں بات نہ کرو جو ہمارے پاس ملنے آیا ہے۔"(36) قریش یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ زائرین کا سارا جلوس اسی رات منظم انداز میں شہر سے چلا گیا۔ کوئی احتجاج نہ ہوا، اور نہ ہی پرانے دشمنوں پر دوبارہ غلبہ پانے کی کوئی کوشش کی گئی۔ اس پُر امن واپسی کے ذریعے مسلمانوں نے ظاہر کیا کہ وہ بہت جلد واپسی کی امید رکھتے ہیں۔

اس انوکھی زیارت کی کہانی بہت تیزی سے عام ہوئی اور بدو آپؐ کے حلیف بننے کے لیے مدینہ آنے لگے۔ اس سے بھی زیادہ اہم امر قریشی نوجوانوں کی آمد کا سلسلہ تھا جنہوں نے اسلام قبول کیا۔ حدیبیہ کے مقام پر آنحضرتؐ نے نو مبایعین کو واپس مکہ بھیجنے کا وعدہ کیا تھا، لیکن آپؐ ایک کمزور کڑی تلاش کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ اول، معاہدے میں نو مسلم خواتین کے حوالے سے کوئی شرط نہ تھی، چنانچہ حدیبیہ کے کچھ ہی عرصہ بعد حضرت عثمانؓ کی سوتیلی بہن مدینہ آئیں اور امت میں شامل ہو گئیں۔ تاہم، آپؐ نے ایک بہادر نوجوان ابو باصر/بصیر کو قبول نہ کیا اور ایک قریش ایلچی کے ساتھ مکہ بھجوا دیا۔ لیکن راستے میں ابو باصر نے اپنے ہمراہی کو مار ڈالا۔ جب آپؐ نے اسے دوبارہ مکہ بھجوایا تو اس نے تجارتی راستے کے قریب بحیرۂ احمر کے ساحل پر پڑاؤ ڈال لیا۔ وہاں مکہ کے کئی دیگر نوجوان بدمعاش بھی اس کے ساتھ آ ملے اور قریب سے گزرنے والے ہر مکی

قافلے پر حملے کرنے لگے۔ قریش کو پتا چلا کہ معاشی رکاوٹ جزوی طور پر دوبارہ حائل ہو گئی تھی۔ انجام کار انہیں آنحضرتؐ سے استدعا کرنا پڑی کہ آپؐ ان نوجوانوں کو مدینہ میں رہنے کی اجازت دیں اور معاہدے پر عمل کرنے کا کہیں۔

یوں نومبایعین کو قبول کرنے پر پابندی کالعدم ہو گئی، اور 629ء میں نئے مسلمان جوق در جوق مدینہ جانے لگے۔ ان میں نوجوان جنگجو عمروؓ بن العاص اور خالدؓ بن ولید بھی شامل تھے، جو حضرت محمدؐ کی کامیابی کے قائل ہو چکے تھے۔ حضرت خالدؓ نے کہا، ''راستہ واضح ہو گیا ہے، یہ شخص یقیناً ایک پیغمبر ہے۔''(37) وہ سرزنش سے خوف زدہ تھے کیونکہ عمرو نے غزوۂ اُحد اور غزوۂ خندق میں بہت سے مسلمانوں کو مارا تھا، لیکن آنحضرتؐ نے انہیں یقین دلایا کہ اسلام میں داخل ہونے سے پرانے حساب کتاب ختم ہو جائیں گے اور ایک نیا آغاز لیا جا سکتا ہے۔

سیاسی فتح سے بھرپور اس سال میں آنحضرتؐ کو ایک نجی مسرت ملی۔ مدینہ میں آپؐ کی زوجیت میں آنے والی کوئی بھی بیوی ماں نہیں بنی تھی، لیکن سکندریہ کے گورنر نے آپؐ کو ایک خوبصورت کنیز بطور تحفہ عنایت کی۔ حضرت مریم (ماریہ) نصرانی تھیں اور اسلام قبول نہیں کرنا چاہتی تھیں لیکن وہ آنحضرت کی سرایہ بن گئیں — ایسی عورت جو غلام کی حیثیت ہی رکھتی لیکن جس کے بچے آزاد ہوتے۔ آنحضرتؐ نے حضرت مریم کو بہت پسند کیا اور 629ء کے آخر میں انہیں حاملہ پا کر بہت خوش ہوئے۔ آپؐ نے اپنے بیٹے کا نام ابراہیم رکھا اور اسے گود میں لیے مدینہ میں پھرتے۔ راستے میں ملنے والے لوگ لڑکے کی خوبصورتی اور آنحضرتؐ سے مشابہت کو سراہتے۔ تاہم، اس خوشی کے ساتھ دکھ بھی سہنا پڑا۔ آپؐ کی بیٹی زینبؓ عمرہ کے کچھ ہی عرصہ بعد فوت ہو گئی تھیں، اور پھر شامی سرحد پر ایک تباہ کن مہم میں آپؐ کے خاندان کے دو افراد بھی مارے گئے۔ ہم اس بدقسمت مہم کے متعلق بہت کم جانتے ہیں۔ آنحضرتؐ غالباً وہاں کے عیسائی عرب قبائل کو بطور حلیف امت میں شامل کرنا چاہتے تھے (جیسا کہ خیبر کے یہودی قبائل کو بھی کیا تھا)۔ تمام موقعوں پر آپؐ نے حضرت زیدؓ اور اپنے کزن جعفر کو تین ہزار افراد کی جمعیت کا سربراہ بنا کر شمال میں بھیجا۔ بحیرۂ مردار کے قریب معطہ نامی گاؤں میں مسلمانوں پر ایک بازنطینی دستے نے حملہ کیا۔ زید، جعفر اور دس دیگر مسلمان مارے گئے اور حضرت خالدؓ نے سپاہیوں کو واپس لانے کا فیصلہ کیا۔

آنحضرتؐ یہ افسوس ناک خبر سن کر سیدھے حضرت جعفر کے گھر تشریف لے گئے تاکہ اپنے عزیز بھائی کی موت کی خبر سنا سکیں۔ حضرت جعفرؓ کی زوجہ حضرت اسماءؓ روٹی پکا رہی تھیں۔ آپؐ کے چہرے پر نظر ڈالتے ہی انہیں معلوم ہو گیا کہ کوئی خوفناک بات ہوئی ہے۔ آنحضرتؐ نے ان کے دونوں بیٹوں کو بلوایا، جھک کر انہیں گلے لگایا اور رونے لگے۔ فوراً حضرت اسماءؓ نے بھی عرب روایت کے مطابق گریہ شروع کر دیا۔ عورتیں بھاگ کر ان کے پاس آئیں۔ آنحضرتؐ نے انہیں ہدایت کی کہ آئندہ چند روز تک گھرانے کے لیے کھانے پینے کا انتظام کریں۔ جب آپؐ گلیوں میں سے گزر کر مسجد کی جانب جا رہے تھے تو زیدؓ کی ننھی بیٹی بھاگتی ہوئی باہر آئی اور آپؐ سے لپٹ گئی۔ آپؐ نے اسے گود میں اٹھا کر پیار کیا اور زار و قطار روتے رہے۔

معطہ میں شکست نے مدینہ میں مسلمانوں کی حالت مزید مخدوش بنا دی۔ جب حضرت خالدؓ فوج کو لے کر واپس آئے تو وہ اور ان کے سپاہی سخت مایوس تھے۔ حضرت محمدؐ نے حضرت خالدؓ کو اپنی ذاتی حفاظت میں لے لیا لیکن نومبر 629ء میں عرب کی صورت حال میں ڈرامائی تبدیلی آئی ۔۔ قریش نے حدیبیہ کا معاہدہ توڑ دیا۔ قبیلہ بکر نے قریش کی مدد اور اکسانے پر بنو خزاعہ پر اچانک حملہ کر دیا جو آنحضرتؐ کے حلیف بن گئے تھے۔ خزاعہ نے آنحضرتؐ سے مدد مانگی اور قریش کو پتا چلا کہ انہوں نے آپؐ کو مکہ پر حملے کا ایک جواز فراہم کر دیا تھا۔ صفوان اور عکرمہ بدستور ڈٹے رہے، لیکن سہیل کے ذہن میں مختلف خیالات آنے لگے تھے۔ تاہم، ابوسفیان ایک قدم مزید آگے گیا اور امن قائم کرنے کی نیت سے مدینہ پہنچا۔

اس موقعہ پر ابوسفیان کو اسلام قبول کرنے کی کوئی خواہش نہ تھی، لیکن کچھ عرصہ سے انہوں نے محسوس کر لیا تھا کہ حالات آنحضرتؐ کے حق میں ہو رہے تھے اور قریش کے لیے ضروری تھا کہ بہترین شرائط پر معاہدہ طے کریں۔ مدینہ میں وہ اپنی بیٹی اُمِ حبیبہ سے ملنے گئے اور آنحضرتؐ کے کچھ قریب ترین صحابہؓ سے ملاقات کر کے خود کو تنازع سے دور رکھنے کی راہ تلاش کرنا چاہی۔ تب وہ واپس مکہ گئے جہاں ہم قبیلہ افراد کو ناگزیر حقیقت قبول کرنے پر مائل کرنے کی کوشش کی۔ ان کی روانگی کے بعد آنحضرتؐ نے ایک نئی مہم کی منصوبہ بندی شروع کر دی۔

10 رمضان (جنوری 630ء) کو آنحضرتؐ کسی بھی سابقہ موقعہ کی نسبت کہیں بڑی فوج لے کر

ہمیشہ کے لیے مدینہ سے روانہ ہوئے۔ امت کے تقریباً سبھی لوگ رضا کارانہ طور پر شامل ہوئے تھے اور راستے میں مسلمانوں کے بدو حلیف بھی ساتھ ملتے گئے۔ یوں کل تعداد 10 ہزار افراد سے زائد ہوگئی۔ سکیورٹی کی وجوہ کی بناء پر مہم کی منزل کو راز رکھا گیا، لیکن کافی پُر جوش قیاس آرائیاں ہونا قدرتی امر تھا۔ یقیناً مکہ ایک ممکنہ منزل تھی، لیکن یہ بھی ممکن تھا کہ آنحضرتؐ طائف کا رخ کرتے جو اب بھی اسلام کا دشمن تھا۔ چنانچہ وہاں ہوازن کے جنوبی قبیلے نے کثیر فوج جمع کرنا شروع کردی۔ مکہ میں قریش راہنماؤں کو بدترین حالات کا خدشہ تھا۔ حضرت عباسؓ، ابوسفیان اور خزاعہ سردار بدیل سب نے رات کی تاریکی میں مسلم پڑاؤ کی راہ لی۔ وہاں آنحضرتؐ نے ان کا استقبال کیا اور ابوسفیان سے پوچھا کہ کیا وہ اسلام قبول کرنے کے لیے تیار ہیں۔ ابوسفیان نے جواب دیا کہ یقیناً وہ اللہ کو واحد خدا مانتے ہیں — کیونکہ بت بے کار ثابت ہوئے تھے — لیکن حضرت محمدؐ کے پیغمبر ہونے کے حوالے سے اب بھی شکوک کا شکار ہیں۔ لیکن وہ مہیب فوج کے تمام ارکان کو فجر کے وقت مکہ کی جانب رخ کرکے سجدہ ریز ہوتے دیکھ کر بہت حیران اور متاثر ہوئے۔ اور جب انہوں نے مختلف قبائل کو شہر کی جانب مارچ کرتے دیکھا تو محسوس کرلیا کہ قریش کے پاس ہتھیار ڈال کر ختم کرنے کے سوا کوئی راہ نہیں۔

وہ فوراً مکہ واپس گئے اور چلا چلا کر لوگوں کو بلایا: ''اے قریش، یہ محمدؐ ہیں جو ایک ناقابلِ مدافعت فوج لے کر تمہاری طرف آئے ہیں!'' تب انہوں نے قریش کو ایک پیشکش کی جس کا مشورہ حضرت علیؓ نے انہیں مدینہ میں قیام کے دوران دیا تھا: جو شخص بھی ہتھیار پھینکنے کو تیار ہو خود کو ان کی نجی حفاظت میں دیدے؛ آنحضرتؐ نے یہ تجویز مان لی۔ وہ ابوسفیان کے گھر میں پناہ لے سکتے یا اپنے ہی گھر میں رہ سکتے تھے۔ ابوسفیان کی بیوی ہند بہت غضبناک ہوئی اور اسے مونچھوں سے پکڑ کر شہر کے لوگوں سے کہنے لگی: ''اسے مار ڈالو! یہ اپنے لوگوں کا کیسا برا محافظ ہے!'' ابوسفیان نے درخواست کی کہ وہ ہند کی بات نہ سنیں۔ انہوں نے لوگوں کو بتایا کہ دشمنی کا وقت ختم ہوگیا ہے۔ ان کی تشویش ناک متانت نے زیادہ تر قریش کو قائل کرلیا۔ آخر کار اہلِ مکہ اظہارِ اطاعت کے طور پر اپنے اپنے گھروں میں بند ہو کر بیٹھ رہے۔

تاہم، چند ایک لڑنے کے خواہش مند تھے۔ عکرمہ، صفوان اور سہیل نے ایک چھوٹی سی فوج جمع

کر کے حضرت خالدؓ کی زیرِ قیادت دستے پر حملہ کیا جو شہر کی جانب آ رہا تھا، لیکن انہیں جلد ہی منہ کی کھانا پڑی۔ سہیل نے اپنے ہتھیار رکھ دیے اور گھر واپس چلا گیا۔ بقیہ مسلمان فوج تلوار کا ایک بھی وار کیے بغیر شہر میں داخل ہوگئی۔ آنحضرتؐ نے کعبہ کے نزدیک اپنا سرخ خیمہ نصب کیا اور حضرت اُمِ سلمہؓ و میمونہؓ کو بھی بلوایا ــــ دو قریشی بیویاں جو آپؐ کے ہمراہ تھیں۔ حضرت علیؓ اور فاطمہؓ بھی آپؐ کے پاس تشریف لے آئے۔ اقامت اختیار کرنے کے کچھ ہی دیر بعد حضرت علیؓ کی بہن امِ ہانیؓ آئیں اور اپنے دو عزیزوں کی جان بخشی کی استدعا کی جنہوں نے لڑائی میں حصہ لیا تھا۔ اگرچہ حضرت علیؓ اور حضرت فاطمہؓ انہیں قرار واقعی سزا دلوانا چاہتے تھے، لیکن آنحضرتؐ نے فوراً ان کو تحفظ دینے کا وعدہ کر لیا۔ آپؐ خون میں انتقام کی کوئی خواہش نہیں رکھتے تھے۔ کسی کو بھی زبردستی قبول اسلام پر مجبور نہ کیا گیا اور نہ ہی کوئی دباؤ ڈالا گیا۔ اب بھی مفاہمت اور مصالحت آپؐ کا اولین مقصد تھا۔

آپؐ کچھ دیر سونے کے بعد اٹھے اور صبح کی نماز ادا کی۔ پھر آپؐ نے قصویٰ پہ سوار ہو کر کعبہ کے گرد سات چکر لگائے اور ''اللہ اکبر'' کی صدا بلند کی۔ مسلمانوں نے بھی یہ نعرہ لگانا شروع کر دیا اور جلد ہی سارا شہر اللہ اکبر کی آوازوں سے گونج رہا تھا ــــ اسلام کی حتمی فتح کا اعلان۔ اس کے بعد آنحضرتؐ نے حرم میں رکھے بتوں کی جانب توجہ مبذول کی۔ اپنے گھروں کی چھتوں اور بالکنیوں میں جمع قریش آپؐ کو ہر ایک پتھر کا بت پاش پاش کرتے دیکھتے رہے۔ آپؐ ساتھ ساتھ یہ آیت تلاوت فرما رہے تھے: ''کہہ دے حق آگیا اور باطل بھاگ گیا۔ یقیناً باطل بھاگ جانے والا ہی ہے۔''(38) خانہ کعبہ کے اندر دیواریں دیوتاؤں اور دیویوں کی تصاویر سے سجائی گئی تھیں۔ آنحضرتؐ نے ان سب کو کھرچ ڈالنے کا حکم دیا، البتہ ایک روایت کے مطابق آپؐ نے حضرت عیسیٰؑ اور حضرت مریم کی تصاویر جوں کی توں چھوڑ دینے کی اجازت دی۔

اس وقت کچھ ایک قریش ہمت کر کے اپنے گھروں سے باہر آئے اور کعبہ کی جانب چل دے۔ وہاں وہ آنحضرتؐ کے باہر آنے کا انتظار کرنے لگے۔ آپؐ بیت اللہ کے سامنے کھڑے ہوئے اور ان سے عہد جاہلیہ والا تکبر ترک کرنے کی درخواست کی: ''اے قریش، دیکھو خدا نے اجداد کے کارناموں پر غرور سمیت جاہلیت کو تمہارے درمیان سے ختم کر دیا ہے۔ انسان محض اللہ کا

شعوری معتقد یا پھر بدقسمت گنہگار ہے۔ تمام انسان آدم کی اولاد ہیں، اور آدم کو مٹی سے تخلیق کیا گیا تھا۔''(39) آخرکار آپ نے اللہ کی آیات کا حوالہ دیا جن میں ساری انسانیت کی بات کی گئی ہے:

> دیکھو، ہم نے تم سب کے جوڑے بنائے، اور تمہیں قوموں اور قبیلوں میں بانٹا تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچان سکو۔ تم میں سے وہی شخص اللہ کی نظر میں اعلیٰ ترین ہے جو اس کا نہایت گہرا شعور رکھتا ہے۔ دیکھو اللہ علیم وخبیر ہے۔(40)

حقیقی کریم اب ایک جارحیت پسند شاونی (Chauvnist) نہیں رہا تھا، بلکہ پُرتعظیم خوف سے بھر گیا۔ قبیلے اور قوم کا مقصد اب اپنی برتری جتانا نہیں تھا؛ ایک دوسرے پر غلبہ پانے، فتح کرنے، زبردستی اپنا ہم مسلک بنانے یا دیگر لوگوں کو تباہ کرنے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے تھی، بلکہ انہیں ایک دوسرے سے واقف ہونے کی ضرورت تھی۔ دوسروں کے ساتھ مل جل کر ایک گروہ میں — جن میں سے کچھ لوگ قرابت کے باوجود غیر مصالحانہ تھے — زندگی گزارنے کے تجربے نے قبائلیوں یا محبِ وطن افراد کو غیروں کے مقابلے کے لیے تیار کیا ہوگا۔ اس کا نتیجہ نسلِ انسانی کے اتحاد کو وقعت دینے کی صورت میں سامنے آیا۔ آنحضرتؐ عرب میں شرف کا تصور نئے سرے سے متعین کرنے اور اس کی جگہ ایک زیادہ ہمہ گیر، دردمندانہ اور منکسر مثالی تصور متعارف کروانے میں کامیاب ہوئے۔

لیکن کیا قریش اس کے لیے تیار تھے؟ آنحضرتؐ نے عام معافی کا اعلان کیا۔ صرف دس کے قریب افراد کو بلیک لسٹ کیا گیا۔ ان میں عکرمہ (لیکن کسی وجہ سے صفوان نہیں) اور وہ لوگ شامل تھے جنھوں نے مسلمانوں کے خلاف پراپیگنڈا کیا یا خاندان رسولؐ کو گزند پہنچایا تھا۔ تاہم، ان میں سے کچھ بدخواہوں نے معافی مانگ لی، اور لگتا ہے کہ انہیں معاف کر دیا گیا۔ کعبہ کے سامنے اس تقریر کے بعد آنحضرتؐ کوہِ صفا پر گئے اور اہلِ مکہ کو حلفِ وفاداری اٹھانے کا کہا۔ ایک ایک کر کے تمام قریش آپؐ کے پاس آئے۔ آپ حضرات عمرؓ و ابوبکرؓ کے ساتھ تشریف فرما تھے۔ ابوسفیان کی بیوی ہند بھی آئی جو غزوۂ احد کے بعد حضرت حمزہؓ کا مثلہ کرنے کی وجہ سے بلیک لسٹ کیے گئے افراد میں شامل تھی۔ وہ بدستور ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولی، ''آپ ماضی کی باتوں کے

لیے مجھے معاف کر دیں تو اللہ آپؐ کو معاف کرے گا!'' آنحضرتؐ نے اس سے پوچھا کہ کیا وہ زنا، چوری اور بچوں کو ہلاک کرنے سے باز رہنے کا عہد کرتی ہے۔ کیا وہ وعدہ کرتی ہے کہ اپنے بچوں کو نہیں قتل کرے گی؟ ہند نے جواب دیا: ''ہم نے ان بچوں کو پال پوس کر جوان کیا، لیکن آپ نے انہیں بدر کے دن مار ڈالا۔'' آنحضرتؐ نے مصلحتاً یہ بات نظر انداز کر دی۔[41] ہند نے قبول اسلام کا فیصلہ کیا اور آپؐ کو بتایا کہ اب اس کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی جا سکتی کیونکہ وہ اسلام قبول کر چکی ہے۔ آنحضرتؐ مسکرائے اور کہا کہ یقیناً وہ آزاد ہے۔ جلد ہی ہند نے اپنے شوہر اور بیٹوں کو امت میں اہم عہدے ملتے دیکھا۔ یہ ابوسفیان کے تعاون کا انعام تھا۔

صفوان اور عکرمہ کے رشتہ داروں نے جان کی امان مانگی۔ آنحضرتؐ نے وعدہ کیا کہ اگر وہ آپؐ کو راہنما تسلیم کر لیں تو انہیں مکہ میں داخل ہونے کی اجازت ہوگی۔ دونوں نے واپسی کا فیصلہ کیا اور عکرمہ نے پہلے اسلام قبول کیا۔ آنحضرتؐ نے مشفق انداز میں اسے مبارک دی اور اس کے باپ ابوجہل کے خلاف برے کلمات کہنے سے سب کو منع کر دیا۔ صفوان اور سہیل دونوں نے بیعت کی لیکن ابھی تک باقاعدہ اسلام قبول نہیں کر سکے تھے ___ البتہ وہ چند دن بعد اپنے عہد سے منحرف ہو گئے۔

اپنے شہر کو محفوظ بنا چکنے کے بعد آنحضرتؐ کو ہوازن اور طائف کے قبائل سے نمٹنا پڑا۔ آپؐ جنوری 630ء کے آخر میں حنین کے مقام پر انہیں شکست دینے میں کامیاب ہوئے۔ ہوازن نے آپؐ کے ساتھ وفاداری کا عہد کر لیا۔ مسلمان طائف پر قبضہ نہیں کر سکے تھے، لیکن شہر اپنا مرکزی بدو حلیف کھو جانے کے باعث بالکل تنہا ہو گیا اور ایک سال بعد ہتھیار پھینک دیے۔ حنین میں فتح کے بعد مالِ غنیمت تقسیم کرتے وقت آپؐ نے ابوسفیان، سہیل اور صفوان کو گراں قدر حصہ دیا۔ صفوان اس قدر جذباتی ہوا کہ فوراً اطاعت اختیار کر لی۔ ''میں گواہی دیتا ہوں کہ کوئی بھی نفس آپؐ جیسا نیک نہیں؛ آپ یقیناً اللہ کے رسول ہیں۔ لا الٰہ الا اللّٰہ محمد الرسول اللّٰہ۔''[42] سہیلؓ نے بھی پیروی کی۔ کچھ انصار اس بدیہی اقربا پروری پر خفا ہوئے۔ کیا اس کا مطلب تھا کہ آنحضرتؐ انہیں چھوڑ دیں گے اور اپنے قبیلے کے ساتھ دوبارہ متحد ہو جائیں گے؟ آنحضرتؐ نے فوراً انہیں ایک تحریک انگیز تقریر کے ذریعہ تسلی دی جس کے باعث کئی انصار رونے لگے۔ آپؐ

ہجرت کے وقت ان کی فراخدلی کو ہرگز نہیں بھول سکتے تھے، اور وعدہ کیا کہ مکہ میں قیام پذیر ہونا تو دور کی بات ہے، وہ بقیہ زندگی مدینہ میں ہی رہیں گے۔ آپؐ نے پوچھا، "کیا تم اس پر مطمئن نہیں ہو کہ دوسرے لوگ تمہارے ریوڑ لے جائیں اور چرائیں جبکہ تم اللہ کے پیغمبر کے پاس ہی ٹھہرو؟ اگر تمام لوگ ایک طرف اور انصار دوسری طرف جائیں تو میں انصار کا ہی ساتھ دوں گا۔ اللہ انصار، ان کے بیٹوں اور بیٹیوں کے بیٹوں پر رحم کرے۔"[43]

یہ ایک انوکھی فتح تھی، اور غیر جانب دار تجزیہ نگار سوچنے لگتا ہے کہ مسلمان اور قریش لڑے ہی کیوں تھے۔[44] آنحضرتؐ اپنے وعدے پر قائم رہے اور مہاجرین و انصار کے ہمراہ واپس مدینہ تشریف لے گئے۔ آپؐ نے خود مکہ پر حکومت کرنے کی کوشش کی اور نہ ہی قریش حکام کی جگہ اپنے صحابہ کو تعینات کیا؛ آپؐ نے ایک خالصتاً اسلامی حکومت بھی قائم نہ کی۔ تمام سابقہ معزز شخصیات کو حرم میں سابقہ عہدے حاصل رہے اور نظامِ مراتب بھی جوں کا توں رہا۔ آپؐ کے بدترین دشمنوں کو نہ صرف بحال کیا بلکہ تحائف سے نوازا بھی گیا۔ جب آنحضرتؐ حرم کا مؤثر ترین وظیفہ ـــ یعنی زائرین کو پانی پلانا ـــ انجام دینے کے لیے اس شخص کو دوبارہ نامزد کرنے لگے جس نے آپؐ کو کعبہ کی چابیاں دی تھیں تو آپؐ نے پوچھا: "یقیناً اب تم دیکھ سکتے ہو کہ چابیاں میرے ہاتھ میں ہیں اور میں جسے چاہوں یہ دے سکتا ہوں؟" اس اعلیٰ شخصیت نے سوچا کہ یقیناً یہ عہدہ اب کسی مسلمان کو ہی ملے گا، لہٰذا اس نے کہا، "تو پھر قریش کی شان اور طاقت ختم ہو سکتی ہے!" آنحضرت نے فوراً جواب دیا: "اس کے برعکس یہ قریش کی شان و شوکت میں اضافے کا دن ہے!"[45] اور چابیاں اسے واپس کر دیں۔

آنحضرتؐ کا مشن تقریباً پورا ہو چکا تھا۔ گھر واپسی کے بعد ابن ابیعہ کے دھڑے کی جانب سے مخالفت جاری رہی۔ آپؐ کو ہلاک کرنے کی ایک اور سازش ہوئی۔ اکتوبر 631ء میں آپؐ کو پتا چلا کہ مدینہ میں ایک مسجد مخاصمت پرور افراد کی آماجگاہ بن گئی ہے، چنانچہ آپؐ نے اس مرکز کو تباہ کرنے کا سوچا۔ اگلی صبح آپؐ نے اپنے خلاف سازش کے ملزموں سے پوچھ گچھ کی تو انہوں نے فوراً معافی مانگ لی۔ بیشتر نے قابلِ فہم جواز پیش کیا اور مبرّیٰ ہوئے، البتہ تین افراد سے امت نے تقریباً دو ماہ تک بات چیت منقطع کیے رکھی۔ لگتا ہے کہ اس کے ساتھ ہی مسلمانوں کی مخالفت ختم

ہوگئی۔ اس توبہ کے کچھ ہی عرصہ بعد ابن ابیعہ فوت ہوگیا اور آنحضرتؐ اپنے اس دیرینہ دشمن کی قبر پر گئے۔ آخرکار آپؐ نے مدینہ میں ایک ہم آہنگ اور متحد معاشرہ قائم کرنے میں کامیابی حاصل کر لی تھی، اور آئے روز مزید بدو آپؐ کی سیاسی بالادستی کو قبول کرنے لگے، حالانکہ وہ اسلام کے معتقد نہ تھے۔ ہجرت کے بعد دس سال کے مختصر عرصے میں آنحضرتؐ نے عرب کا سیاسی اور روحانی منظر ہمیشہ کے لیے بدل دیا۔

تاہم، آنحضرتؐ کی صحت جواب دینے لگی تھی اور 632ء کے آغاز میں آپؐ کو اپنی زندگی کی منزل قریب آنے کا احساس بڑھتا گیا۔ کم سن بیٹے ابراہیم کی موت کا آپؐ کو بہت صدمہ ہوا اور آپؐ بہت دلگیر ہوئے، البتہ آپؐ کو پورا یقین تھا کہ جلد ہی جنت میں ان سے ملاقات ہوگی؛ لیکن جب حج کا روایتی مہینہ آیا تو آپؐ نے حج کے لیے جانے کا اعلان کیا اور تمام بیویوں اور حاجیوں کے وسیع ہجوم کو ساتھ لے کر ماہ فروری کے آخر میں روانہ ہوگئے۔ آپؐ ماہِ مارچ کے آغاز میں مکہ کے باہر پہنچے۔ مسلمانوں نے آپؐ کی زیرِ قیادت رسوم حج انجام دیں جو عربوں کو بہت عزیز تھیں، لیکن اب ان رسوم کو ایک نیا مفہوم مل گیا۔ مسلمانوں کو اپنے قبائلی معبودوں کو دوبارہ گلے لگانے کی بجائے خانۂ کعبہ میں جمع ہونا تھا جو ان کے جدِ امجد حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسمٰعیلؑ نے تعمیر کیا تھا۔ صفا اور مروہ کے درمیان سات مرتبہ سعی کرتے وقت آنحضرتؐ نے زائرین کو ہدایت کی کہ وہ حضرت اسمٰعیلؑ کی ماں حضرت ہاجرہ کی بے چینی یاد کریں جو حضرت ابراہیمؑ سے جدائی کے بعد بیٹے کے لیے پانی کی تلاش میں دوڑی تھیں۔ خدا نے زمین کی گہرائیوں میں سے زمزم چشمہ جاری کر کے انہیں بچالیا۔ اس کے بعد زائرین نے کوہِ عرفات کی ڈھلوانوں پہ کھڑے ہو کر ساری انسانیت کے ساتھ یگانگت کو یاد کیا۔ کہا جاتا ہے کہ خدا نے یہیں پر بابائے انسانیت حضرت آدمؑ سے میثاق باندھا تھا۔

منیٰ میں انہوں نے تین ستونوں کو کنکریاں ماریں۔ یہ رسم ایک پاک زندگی کی خاطر برائی کے خلاف مسلسل جہاد کی یاد دہانی تھی۔ آخر میں انہوں نے سنت ابراہیمیؑ کے مطابق ایک بھیڑ ذبح کی۔

آج کوہِ عرفات پر اس جگہ مسجد نمرہ قائم ہے جہاں آنحضرتؐ نے مسلم برادری کو آخری خطبہ دیا تھا۔ آپؐ نے انہیں تلقین کی کہ آپس میں منصفانہ سلوک کریں، عورتوں کے ساتھ نرمی سے پیش

آئیں، خونیں جھگڑے ترک کر دیں اور جاہلیہ والی انتقام پروری چھوڑ دیں۔ مسلمانوں کو ایک دوسرے کے ساتھ لڑنے سے منع کر دیا گیا: ''یاد رکھو! مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ اپنے بھائی سے صرف وہی چیز لینا جائز ہے جو وہ تمہیں اپنی مرضی سے دے دے، سو تفرقہ میں نہ پڑو۔'' آنحضرتؐ نے آخر میں فرمایا: ''اے خدا، کیا میں نے تجھے نہیں بتایا؟'' آپ کی آخری پکار میں ایک التجا تھی۔ آپؐ جانتے تھے بار بار تلقین کے باوجود بھی مسلمانوں نے پوری طرح آپؐ کا پیغام نہیں سمجھا۔ شاید آپؐ کو معلوم تھا کہ یہ آپؐ کا آخری خطبہ ہے۔ غالباً آپؐ نے وہاں کھڑے ہو کر سوچا کہ آپ کی تمام کوششیں رائیگاں کیوں گئیں؟ ''اے لوگو، کیا میں نے پوری ایمان داری کے ساتھ تم تک پیغام پہنچا دیا ہے؟'' مجمعے نے ہاں میں جواب دیا: ''اللّٰھم نعم!'' آپؐ نے یقین دہانی کی غرض سے یہی سوال بار بار پوچھا۔ ہر مرتبہ وادی میں اللّٰھم نعم کی صدا گونجی۔ تب آنحضرتؐ نے انگشتِ شہادت آسمان کی جانب اٹھائی اور فرمایا: ''اے اللہ، تو گواہ رہنا۔''(46)

جب آپؐ واپس مدینہ آئے تو سر میں شدید درد محسوس کرنے لگے، لیکن مستقل طور پر بستر سے نہ لگے۔ آپؐ دُکھتے ہوئے سر کو کپڑے سے باندھ لیتے اور مسجد میں جا کر نماز پڑھاتے یا لوگوں سے خطاب کرتے۔ صبح کو آپؐ نے اُحد میں شہید ہونے والے مسلمانوں کے اعزاز میں کافی طویل عرصہ تک دعا کی اور پھر فرمایا: ''اللہ نے اپنے خادموں میں سے ایک کو اِس دنیا اور الوہی دنیا کے درمیان انتخاب کی اجازت دی اور اس نے الوہی دنیا منتخب کی۔'' اس بات کو آپؐ کے وصال کا حوالہ سمجھنے میں صرف ابوبکرؓ کامیاب ہوئے اور زار و قطار رونے لگے۔ آنحضرتؐ نے فرمایا: ''اے ابوبکرؓ، آہستہ، آہستہ۔''(47)

آخرکار آنحضرتؐ حضرت میمونہؓ کے حجرے میں جا کر بستر پہ لیٹ گئے۔ آپؐ کی بیویاں محبت بھری نظروں سے دیکھ رہی تھیں، اور انہوں نے آپؐ کو یہ پوچھتے ہوئے محسوس کیا: ''کل میں کہاں ہوں گا؟ کل میں کہاں ہوں گا؟'' تب انہیں معلوم ہوا کہ آپؐ حضرت عائشہؓ کے ساتھ ہونے کے متعلق پوچھ رہے تھے۔ زوجین نے آپؐ کو حضرت عائشہؓ کے حجرے میں پہنچانے اور وہاں پر ہی تیمارداری کرنے کا فیصلہ کیا۔ آنحضرتؐ اپنا سر مبارک حضرت عائشہؓ کی گود میں رکھ کر لیٹ گئے،

لیکن مسلمانوں کو یقین تھا کہ بس آپؐ کی طبیعت خراب ہے اور جلد ہی صحت یاب ہو جائیں گے۔ اگر چہ حضرت ابوبکرؓ نے بار بار خبردار کیا کہ پیغمبرؐ زیادہ عرصہ ہمارے درمیان نہیں رہیں گے، لیکن لوگوں کو یقین نہ آیا۔ جب آپؐ کی طبیعت اس قدر بگڑ گئی کہ نماز کے لیے مسجد بھی نہ جا سکے تو حضرت ابوبکرؓ کو امامت کروانے کے لیے کہا۔ تاہم، آپؐ اس بیماری کی حالت میں بھی کبھی کبھی حضرت ابوبکرؓ کے قریب جا بیٹھتے۔

12 ربیع الاول (8 جون، 632ء) کو حضرت ابوبکرؓ نے نماز کے دوران لوگوں کی توجہ منتشر ہوتے دیکھی۔ انہیں فوراً محسوس ہو گیا کہ آنحضرتؐ مسجد میں داخل ہوئے ہوں گے۔ آپؐ کی حالت بہتر لگ رہی تھی۔ درحقیقت کسی نے کہا کہ انہوں نے آپؐ کے چہرے کو کبھی اتنا دمکتا ہوا اور پُرنور نہیں دیکھا تھا۔ جماعت میں خوشی اور راحت کی ایک لہر دوڑ گئی۔ حضرت ابوبکرؓ نے امامت کی جگہ چھوڑ دی، لیکن آنحضرتؐ نے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھا، واپس امامت کے مقام کی جانب دھکیلا اور خود نماز ختم ہونے تک بیٹھ گئے۔ نماز ختم ہونے پر آپؐ واپس حضرت عائشہؓ کے حجرے میں گئے اور سکون سے ان کی گود میں سر رکھ دیا۔ اب آپؐ کی حالت اتنی بہتر لگتی تھی کہ حضرت ابوبکرؓ اپنی بیوی سے ملنے چلے گئے جو مدینہ کے دوسرے کنارے پر رہتی تھی۔ دوپہر کے وقت حضرت علیؓ اور حضرت عباسؓ نے اندر جھانکا اور لوگوں کو خوش خبری دی کہ آنحضرتؐ کی حالت بہتر ہو رہی ہے۔ شام ہوئی تو حضرت عائشہؓ نے محسوس کیا کہ آپ کا سرِ مبارک پہلے کی نسبت زیادہ وزنی ہو گیا ہے۔ آپؐ بے ہوش معلوم ہوئے۔ پھر بھی حضرت عائشہؓ کو اصل صورت حال اندازہ نہ ہو سکا۔ بعد میں آپؓ نے بتایا: ''میری لاعلمی اور کمسنی کی وجہ سے آنحضرتؐ کا وصال میری بانہوں میں ہوا۔'' آپؓ نے اپنے محترم شوہر کو یہ الفاظ کہتے سنا، ''نہیں، آسمان کی اعلیٰ ترین ہستی۔'' حضرت جبرئیلؑ آپؐ کو خالق مطلق تک لے جانے کے لیے آئے تھے۔[48] نیچے نظر ڈالنے پر حضرت عائشہؓ کو پتا چلا کہ آپؐ کا وصال ہو گیا ہے۔ انہوں نے شوہر کا سرِ مبارک آرام سے تکیے پر رکھا اور روایتی انداز میں اپنا منہ اور چھاتی پیٹتے ہوئے گریہ کرنے لگیں۔

جب لوگوں نے عورتوں کی آہ و زاری سنی تو بجھے ہوئے چہروں کے ساتھ مسجد کی طرف بھاگے۔ سارے نخلستان میں خبر تیزی سے پھیلی اور حضرت ابوبکرؓ فوراً واپس روانہ ہو گئے۔ انہوں

نے آنحضرتؐ کے چہرہ مبارک پر نظر ڈالی، آپؐ کو بوسہ دیا اور الوداع کہا۔ مسجد میں انہوں نے حضرت عمرؓ کو لوگوں سے خطاب کرتے ہوئے پایا۔ حضرت عمرؓ نے یہ یقین کرنے سے صاف انکار کر دیا کہ آنحضرتؐ کا وصال ہو گیا ہے: آپؐ کی روح محض عارضی طور پر جسم کو چھوڑ کر گئی تھی (انہوں نے کہا) اور یقیناً آپؐ جلد ہی اپنے لوگوں کے پاس واپس آ جائیں گے: آپؐ تمام انسانوں کے بعد دنیا سے جائیں گے۔ حضرت عمرؓ کی غمزدہ حالت دیکھ کر حضرت ابوبکرؓ نے کہا، ''اطمینان سے، عمر۔'' لیکن حضرت عمرؓ مسلسل وہی بات کہتے رہے۔ حضرت ابوبکرؓ خاموشی سے آگے آئے اور آپؓ کی پُرسکون حالت نے ضرور لوگوں کو متاثر کیا ہوگا، کیونکہ انہوں نے حضرت عمرؓ کو چھوڑ کر آپؓ کو گھیرے میں لے لیا۔

حضرت ابوبکرؓ نے انہیں یاد دلایا کہ حضرت محمدؐ نے اپنی ساری زندگی توحید کی اشاعت کے لیے وقف کی تھی۔ انہوں نے یہ کیسے سوچ لیا کہ آپؐ لافانی تھے؟ یہ بات تو آپؐ کو الوہی یا خدائے ثانی قرار دینے کے مترادف ہوگی۔ آنحضرتؐ نے لوگوں کو بار بار متنبہ کیا تھا کہ انہیں ویسا الوہی درجہ نہ دیا جائے جیسا عیسائیوں نے حضرت عیسیٰؑ کو دے رکھا تھا۔ آپؐ فانی انسان تھے، باقی تمام انسانوں کی طرح۔ آنحضرتؐ کی وفات ہونے سے انکار کرنا گویا آپؐ کے پیغام کو جھٹلانا تھا۔ لیکن جب تک مسلمان خدا کو واحد لائق پرستش ہستی مانتے ہیں، حضرت محمدؐ ان کے ذہنوں میں زندہ رہیں گے۔ حضرت ابوبکرؓ نے قطعی انداز میں بحث ختم کی: ''اے لوگو، اگر تم میں سے کوئی شخص آنحضرتؐ کی پوجا کرتا ہے تو جان لو کہ وہ فوت ہو چکے ہیں۔ اگر کوئی شخص اللہ کی پرستش کرتا ہے تو اللہ زندہ اور لافانی ہے۔''(49) آخر میں انہوں نے ایک آیت تلاوت فرمائی جو غزوۂ اُحد کے بعد اس وقت نازل ہوئی تھی جب بہت سے مسلمان آپؐ کی شہادت کی افواہ سن کر پریشانی میں مبتلا تھے۔ ''محمدؐ محض ایک پیغمبر ہیں۔ آپ سے پہلے بھی پیغمبر گزرے ہیں۔ اگر وہ فوت ہوں یا مار دیے جائیں تو کیا تم پھر جاؤ گے؟ اگر کوئی شخص پھر گیا تو یقیناً وہ اللہ کو کوئی نقصان نہیں پہنچائے گا، اور اللہ شکر ادا کرنے والوں کے ساتھ ہے۔''(50) ان آیات نے لوگوں پہ ایسا اثر ڈالا کہ یوں لگا جیسے وہ انہیں پہلی مرتبہ سن رہے ہوں۔ حضرت عمرؓ بھی قائل ہو گئے۔ ''خدا کی قسم، جب میں نے حضرت ابوبکرؓ کو ان آیات کی تلاوت کرتے سنا تو گنگ ہو گیا۔ میری ٹانگیں بے جان ہو گئیں اور میں یہ جان کر

زمین پہ گر گیا کہ پیغمبر یقیناً فوت ہو گئے تھے۔"[51]

حضرت محمدؐ کے پیروکاروں میں سے معدودے چند لوگ ہی آپؐ کے پیغمبرانہ مشن کی پوری اہمیت سمجھ سکے تھے۔ لوگوں نے نہایت مختلف وجوہ کی بنا پر اسلام قبول کیا۔ بہت سے لوگ سماجی انصاف کے مثالی تصور کو تو مانتے تھے، لیکن عدم تشدد اور مفاہمت کے تصور کو نہیں۔ باغی لٹیرے نوجوان — جو ابو بصیر کے ماتحت تھے — ایک قطعی مختلف ایجنڈا لیے ہوئے تھے۔ 628ء میں رضا کارانہ طور پر حج کے لیے نہ جانے والے بدو قبائلیوں کے پاس اسلام سے مذہبی وابستگی کی بجائے ایک سیاسی ایجنڈا تھا۔ اسلام بہت آغاز سے ہی یک قالب وجود نہیں تھا۔

یگانگت کے اس فقدان میں کوئی بھی انوکھی بات نہیں۔ اناجیل میں یسوع مسیح کے شاگردوں کو عموماً کم فہم اور راندھوں کے طور پر پیش کیا گیا جو ان کے مشن کو سمجھنے سے قاصر تھے۔ سمت نما شخصیات عموماً اپنے وقت سے اس قدر آگے ہوتی ہیں کہ معاصرین انہیں سمجھ نہیں پاتے اور ان کی موت کے بعد تحریک نفاق اور تقسیم کا شکار ہو جاتی ہے — جیسا کہ بدھ مت گوتم سدھارتھ کی موت کے کچھ ہی عرصہ بعد ہین یان اور مہایان فرقوں میں بٹ گیا۔ اسلام میں بھی آنحضرتؐ کے جیتے جی امت کو بانٹنے والی تقسیمات آپؐ کے وصال کے بعد کہیں زیادہ واضح ہو گئیں۔ قرآن کے اصل مذہبی پیغام کو پوری طرح سمجھنے سے قاصر بہت سے بدو یقین رکھتے تھے کہ اسلام آنحضرتؐ کے ساتھ ختم ہو گیا تھا۔ انہوں نے اسی طرح امت سے کنارہ کش ہونے کی کوشش کی جس طرح کسی متوفی سردار کے ساتھ معاہدے سے منحرف ہو جایا کرتے تھے۔ آنحضرتؐ کے وصال کے بعد امت کی قیادت آپؐ کے خلیفہ (جانشین) نے کی۔ پہلے چار خلفاً لوگوں کے منتخب کردہ تھے: حضرات ابو بکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ اور علیؓ جنہیں خلفائے راشدین (ہدایت یافتہ) کے لقب سے جانا جاتا ہے۔ ان خلفاً نے عرب سے باہر جنگیں لڑیں، لیکن اس وقت تک اِن کی کوئی مذہبی اہمیت نہ تھی۔ کسی بھی ریاست کار یا جرنیل کی طرح راشدین ایک سیاسی موقعہ کا ردِ عمل دے رہے تھے — فارسی اور بازنطینی سلطنتوں کا انتشار — نہ کہ کسی قرآنی حکم کا۔ حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ و حسینؓ کی شہادتوں پر منتج ہونے والی خوفناک جنگوں کو بعد ازاں ایک مذہبی اہمیت مل گئی، لیکن یہ محض ایک حاشیہ نشین اور

پسماندہ معاشرے کے ایک نمایاں عالمی طاقت کا رتبہ حاصل کرنے کے نہایت تیز عبوری عمل کی ضمنی پیداوار تھیں۔

مسلمانوں کا ردعمل اس سیاسی اکھاڑ پچھاڑ کی نسبت کہیں زیادہ حیرت انگیز تھا۔ جب انہوں نے ان تباہ کن واقعات پر سوچ بچار کی تو قرآن کے بارے میں ان کی تفہیم بڑھی۔ اسلام میں تقریباً ہر ایک اہم مذہبی اور ادبی تحریک کا سرچشمہ آنحضرتؐ کے اصل تصور کی جانب مراجعت کی خواہش تھی۔ بہت سوں نے متاخر خلفاً کے شاہانہ اندازِ حیات کو ناپسند کیا اور ابتدائی امت کے کفایت شعارانہ انداز کی جانب لوٹنے کی کوشش کی۔ صوفیاً، ماہرینِ الٰہیات اور مصنفین نے اہم سوالات اٹھائے۔ اپنے راسخ العقیدہ راہنماؤں کو ہلاک کر دینے والا معاشرہ خدا سے ہدایت یافتہ ہونے کا دعویٰ کیسے کرسکتا تھا؟ کس قسم کے انسان کو امت کا قائد بننا چاہیے؟ کیا اس قسم کے عیش و عشرت کی زندگی گزارنے اور لوگوں کی ایک وسیع اکثریت کو غربت کی سزا دینے والے حکمران سچے مسلمان ہوسکتے تھے؟

امت کی سیاسی قیادت کے بارے میں اِن سنگین مباحث نے اسلام میں ویسا ہی کردار ادا کیا جو چودہویں اور پندرہویں صدی کی عیسائیت میں مسیح کی الوہیت سے متعلق (Christological) مباحث نے ادا کیا۔ تصوف کی راہبانہ روحانیت کی جڑیں اسی بے اطمینانی میں تھیں۔ صوفیاً نے دربار کی تعیش پسندی سے منہ موڑ لیا اور پیغمبرؐ جیسی زہد و ریاضت والی زندگی گزارنے کی کوشش کی؛ انہوں نے آپؐ کے اسراع (شبینہ سفر) پر مبنی ایک باطنی مثالی نمونہ تیار کیا۔ خود ساختہ ''حامیانِ علیؓ''، یعنی شیعوں کو یقین تھا کہ حضرت علیؓ کی اولاد میں سے ہی کوئی شخص امت کا قائد بننا چاہیے، کیونکہ پیغمبرؐ کی سحر انگیزی صرف انہیں (حضرت علیؓ کو) ورثہ میں ملی تھی۔ شیعوں نے مسلم معاشرے کے مرکزی دھارے کی ناانصافی کے خلاف ایک احتجاجی پاکیزگی وضع کی اور قرآن کی اشراف پسندانہ روح کی جانب مراجعت چاہی۔ اگرچہ اِن اور متعدد دیگر تحریکوں نے آنحضرتؐ کی اعلیٰ ترین شخصیت کو مینارۂ نور سمجھا، لیکن وہ سبھی قرآن کے تصور کو بالکل نئی سمتوں میں لے گئیں اور دکھایا کہ آیات غیر متوقع حالات سے نمٹنے کی لچک رکھتی تھیں جو کہ کسی بھی عظیم عالمی تحریک کی لازمی خصوصیت ہے۔ بہت ابتداً سے ہی مسلمان آنحضرتؐ کو ایک کسوٹی ماننے لگے جس پر وہ اپنے

سیاست دانوں کو پرکھتے اور امت کی روحانی صحت کا اندازہ لگاتے۔

آج اسی تنقیدی جذبے کی ضرورت ہے۔ کچھ مسلمان مفکرین مکہ کے خلاف جہاد کو آنحضرتؐ کے مشن کا نقطۂ عروج سمجھتے اور یہ غور کرنے میں ناکام ہو جاتے ہیں کہ آپؐ نے جنگ و جدل کو ناپسند کر کے ایک عدم تشدد کی پالیسی اپنائی۔ مغربی نقاد بھی آنحضرتؐ کو ایک جنگ پسند شخصیت ثابت کرنے پر تلے ہوئے ہیں اور یہ دیکھنے سے قاصر ہیں کہ آپؐ نے شروع سے ہی جاہلی نخوت اور انا پرستی کی مخالفت کی جس نے نہ صرف ان کے عہد میں جارحیت کی آگ کو بھڑکایا، بلکہ آج کچھ مغربی اور مسلمان راہنماؤں میں بھی ملتی ہے۔ امن اور عملی محبت کا مقصد رکھنے والے پیغمبرؐ اسلام کو پھوٹ اور افتراق کی علامت بنا دیا گیا ہے۔ یہ صورت حال نہ صرف المناک بلکہ اس استحکام کے لیے بھی خطرناک ہے جس پر نوع انسانی کے مستقبل کا دارومدار ہے۔

حضرت محمدؐ کی سوانح لکھنے کی اپنی پہلی کوشش کے آخر میں مَیں نے کینیڈین مصنف ولفرڈ کینٹ وَیل کے الفاظ کا حوالہ دیا تھا۔ اس نے سوئز نہر کا مسئلہ کھڑا ہونے سے کچھ ہی عرصہ قبل، بیسویں صدی کے وسط میں لکھا تھا کہ ایک صحت مندانہ اور فعال اسلام نے صدیوں تک مسلمانوں کو وہ اعلیٰ اقدار اپنائے رکھنے میں مدد دی جن میں آج اہلِ مغرب شریک ہیں، کیونکہ ان کا سرچشمہ ایک مشترکہ روایت میں ہے۔ کچھ مسلمانوں کو مغربی جدیدیت پر اعتراض ہے۔ وہ اہل الکتاب کی ثقافتوں کے خلاف ہو گئے ہیں اور حتیٰ کہ ان برادر مذاہب سے اپنی نئی نفرت کو اسلامی رنگ بھی دینا شروع کر دیا ہے، حالانکہ قرآن نے ان مذاہب کو زوردار انداز میں منظور کیا تھا۔ کینٹ ویل سمتھ نے کہا کہ اگر مسلمانوں کو موجودہ دور کے چیلنجوں کا مقابلہ کرنا ہے تو انہیں ہماری مغربی روایات اور دساتیر کو سمجھنا ہوگا، کیونکہ وہ صفحۂ ہستی سے مٹنے نہیں جا رہیں۔ اگر اسلامی معاشروں نے ایسا نہ کیا تو وہ بیسویں صدی کے امتحان میں پورا نہیں اتر سکیں گے۔ لیکن کینٹ ویل نے یہ اشارہ بھی کیا کہ مغربی لوگوں کے ساتھ بھی ایک مسئلہ ہے: ''یہ سمجھنے میں نااہلی کہ اس سیارے میں نہ صرف کمتر بلکہ ہم رتبہ لوگ بھی ان کے ساجھے دار ہیں۔''

جب تک مغربی تہذیب عقلی و سماجی، سیاسی و اقتصادی طور پر اور مسیحی کلیسیا

دینیاتی طور پر دیگر لوگوں کے ساتھ بھی بااحترام سلوک کرنا نہیں سیکھ لیتا تب تک
یہ دونوں بیسویں صدی کے حقائق سے نمٹنے میں باری باری ناکام ہوں گے۔
یقیناً اس کی وجہ سے پیدا ہونے والے مسائل اسلام کے پیدا کردہ کسی بھی مسئلے
جتنے عمیق ہیں۔(52)

اکیسویں صدی کی مختصر تاریخ دکھاتی ہے کہ فریقین میں سے کسی نے بھی یہ سبق نہیں سیکھے۔ اگر ہمیں تباہی سے بچنا ہے تو مسلمانوں اور مغربی دنیاؤں کو نہ صرف ایک دوسرے کو برداشت کرنا بلکہ ایک دوسرے کی قدر افزائی کرنا بھی سیکھنا ہوگا۔ آنحضرتؐ کی شخصیت ایک اچھا نقطۂ آغاز ہے: آپؐ نے محض آئیڈیالوجی کی بنیاد پر زمرہ بندی کی مدافعت کی: آپؐ نے کبھی کبھی ایسے کام بھی کیے جنہیں قبول کرنا ہمارے لیے مشکل یا ناممکن ہوا۔ لیکن آپؐ ایک عمیق جینیئس کے حامل تھے اور آپؐ نے ایک ایسے مذہب اور ثقافتی روایت کی بنیاد رکھی جس کی قوت تلوار نہیں بلکہ ''اسلام'' کا لفظ تھا — امن اور مفاہمت۔

حوالہ جات

1- مکہ

1- Tor Andrae کی Muhammad: The man and His Faith، ترجمہ Theophil Menzel (لندن، 1936ء)، ص59۔

2- آر اے نکلسن کی A Literary History of the Arabs، میں منقول، (کیمبرج، 1953ء)، ص83۔

3- Toshihiko Izutsu کی Ethico-Religious Concepts in the Quran (مانٹریال اینڈ کنگسٹن، ON، 2002ء)، ص46۔

4- ایضاً، 63۔

5- لبیب ابن ربیعہ، ''معلقہ''، 5.81، Ethico-Religious Concepts in the Quran، 63؛ قرآن 2:170، 43:22-24)۔

6- Izutsu کی Ethico-Religious Concepts in the Quran، ص72۔

7- ایضاً، 29۔

8- زہیر ابن ابی سلمہ، Izutsu کی Ethico-Religious Concepts in the Quran میں اشعار 38-39؛ ص84۔

9- آر اے نکلسن کی A Literary History of the Arabs، ص93۔

10- محمد اے بامیہ، The Social Origins of Islam: Mind, Economy, Discourse (منی پولس، 1999)، صفحات 17-20۔

11- ایضاً، ص30۔

12- ایضاً، ص 11-12۔

13- ایضاً، ص 38۔

14- قرآن، 105۔

15- Johannes Sloek، *Devotional Language* (برلن و نیویارک، 1996ء)، صفحات 89-90۔

16- محمد اے بامیہ، *The Social Origins of Islam: Mind, Economy, Discourse* (منی پولس، 1999ء)، ص 32۔

17- ایضاً، ص 43۔

18- محمد ابن اسحٰق، سیرت النبیؐ؛ لیلہ احمد، *Women and Gender in Islam* (نیوہیون اور لندن، 1992ء)، ص 42۔

19- ایضاً، ص 155۔

20- قرآن، 103:2-3۔

21- قرآن، 6:70؛ 7:51۔

22- Wilhelm Schmidt، *The Origin of the Idea of God*، (نیویارک، 1912ء)۔

23- قرآن، 10:22-24، 24:61، 39:38،63، 43:87، 106:1-3۔

24- Izutsu، *God and Man in the Koran, Semantics of the Koranic Weltanschauung* (ٹوکیو، 1964ء)، صفحات 93-101، 124-29۔

25- F.E. Peters، *The Hajj: The Muslim Pilgrimage to Mecca and the Holy Places* (پرنسٹن، 1994ء)، صفحات 24-27۔

26- ابن الکلبی، *The Book of Idols* in Peters، *Hajj*، ص 29۔

27- بامیہ، *Social Origins of Islam*، صفحات 22-24۔

28- ایضاً، 79-80؛ رضا اسلان، *No god but God, The Origins, Evolution*

and Future of Islam (نیویارک ولندن، 2005ء)، 9-13۔

29- کتاب پیدائش 16۔

30- فلاویئس جوزیفس، The Antiquities of the Jews، I.12.2۔

31- بامیہ، Social Origins of Islam، 25-27۔

32- زبور 135:5۔

33- بامیہ، Social Origins of Islam، 89-144؛ اسلان، No god but God، 13-15؛ Izutsu، God and Man، 107-18۔

34- ابن اسحٰق، سیرت النبی، ص 143۔ (Guillaume کی ''لائف آف محمدؐ'' میں مذکور۔)

35- ایضاً 145۔ (Guillaume کی ''لائف آف محمدؐ'' میں مذکور۔)

36- Peters، ''حج''، صفحات 39-40۔

37- Izutsu، God and Man، 148۔

38- ابن اسحٰق، سیرت النبی، ص 148۔ (Guillaume کی ''لائف آف محمدؐ'' میں مذکور۔)

39- قرآن 96۔

40- قرآن 53:5-9۔

41- ابن اسحٰق، سیرت النبی، ص 153۔ (Guillaume کی ''لائف آف محمدؐ'' میں مذکور۔)

42- ایضاً۔

43- ایضاً، ص 154۔

44- قرآن 21:91، 19:16۔

45- قرآن 97۔

46- Rudolf Otto، The Idea of the Holy، (لندن، آکسفورڈ اور نیویارک، 1950ء)، صفحات 12-40۔

47- قرآن 93۔

2-جاہلیہ

1-اس کا حوالہ ساتویں صدی کے مکی مؤرخ ابن شیفان الزہری نے دیا ہے۔ منٹگمری واٹ نے "Muhammad at Mecca" میں اس کا حوالہ بھی دیا۔

2- محمد ابن اسحق، "سیرت النبیؐ۔"

3- محمد ابن سعد، "کتاب الطبقات الکبیر" 4.1.68، مارٹن لنگز کی "Muhammad: His Life Based on the Earliest Sources" (لندن، 1983ء)، ص 47۔

4-ابن سعد، "کتاب الطبقات،" 3.1.37۔

5- قرآن، 27:45-46، 28:4۔

6- جلال الدین سیوطی، "الاتقان فی علوم القرآن،" Maxime Rodinson، Mohammad (لندن، 1971ء) میں حوالہ، ص 74۔

7- بخاری، "حدیث،" مارٹن لنگز کی "محمدؐ" میں صفحہ 44-45 پر حوالہ۔

8- قرآن 20:114، 75:16-18۔

9- Michael Sells، *Approaching the Quran: The Early Revelations* (ایش لینڈ، OR، 1999ء)، xvi۔

10- ایضاً، 183-84۔

11- Mircea Eliade، *Yoga, Immortality and Freedom* (لندن، 1958ء)، ص 56۔

12- Michael Sells، *Approaching the Quran*، صفحات 183-204۔ نیز دیکھیں قرآن 81:8-9۔

13- قرآن 82:17-18، 83:8-9,10۔

14- Michael Sells، *Approaching the Quran*، ص xliii۔

15- قرآن 81:1-6۔

16- قرآن 99:6-9۔

17- قرآن 90:13-16۔

18- قرآن 81:26۔

19- قرآن 88:21-22۔

20- قرآن 88:17-20۔

21- منگمری واٹ، Muhammad at Mecca، ص 68۔

22- قرآن 26:214۔

23- قرآن 17:26-27۔

24- ابو جریر الطبری، ''تاریخ الرسل والامم والملوک،'' 1171۔

25- قرآن 83:4، 37:12-19۔

26- قرآن 45:23، 36:77-83۔

27- قرآن 83:10-12۔

28- قرآن 6:108، 27:45، 10:71-72۔

29- قرآن 10:72۔

30- Wilfred Cantwell Smith، Faith and Belief (پرنسٹن، 1979ء)، صفحات 44-46؛ Toshihiko Izutsu، Ethico-Religious Concepts in Quran (مانٹریال اور کنگسٹن، ON، 2002ء)، صفحات 132-33۔

31- Tor Andrae، Muhammad: The Man and His Faith ترجمہ Theophile Menzel (لندن، 1936ء)، صفحات 22-35؛ ڈبلیو منگمری واٹ، Muhammad at Mecca: History in the Quran (ایڈنبرگ، 1988ء)، صفحات 03-109۔

32- محمد ابن سعد، ''کتاب الطبقات الکبیر،'' i8، 137۔

33- ابو جریر الطبری، ''تاریخ الرسول والامم والملوک،'' 1192۔

34- قرآن 53:12۔

35- قرآن 53:26۔

36-ابو جریر الطبری، ''تاریخ الرسل والامم والملوک،'' 1192۔

37- محمد ابن سعد، ''کتاب الطبقات الکبیر،'' 137۔

38-ابو جریر الطبری، ''تاریخ الرسل والامم والملوک،'' ص1192۔

39- قرآن 22:52۔

40- قرآن 53:19-23۔

41- قرآن 39:23۔

42- قرآن 59:21۔

43- قرآن 29:17۔

44- قرآن 112۔

45-رضا اسلان، *No god but God: The Origins, Evolution and Future of Islam* (لندن اور نیو یارک، 2005ء)، صفحات 43-46۔

46-ابن اسحٰق، ''سیرت النبیؐ۔''

47- قرآن 17:46، 39:45۔

48- قرآن 38:6۔

49- قرآن 38:4-5۔

50- قرآن 4:16۔

51- قرآن 80:1-10۔

52- Izutsu کی *Ethico-Religious Concepts in the Quran*، 66؛ Wilfred Cantwell Smith، *Faith and Belief* (پرنسٹن، 1979ء)، 39-40۔

53- قرآن 29:61-63، 2:89، 27:14۔

54- قرآن 17:23-24، 46:15۔

55- Izutsu کی *Ethico-Religious Concepts in the Quran*، 127-57۔

56- قرآن 7:75-76، 39:59، 31:17-18، 23:45-47، 38:71-75۔

57- قرآن 15:94-96، 21:36، 18:106، 40:4-5، 68:56، 22:8-9۔

58- قرآن

59- Izutsu کی *Ethico-Religious Concepts in the Quran*، 28-45۔

60- ایضاً، 28۔

61- ایضاً، 68-69، قرآن 14:47، 39:37، 15:79، 30:47، 44:16۔

62- قرآن 90:13-17۔

63- قرآن 25:63۔

64- قرآن 111۔ یہ واحد موقع ہے جہاں قرآن نے آنحضرتؐ کے کسی دشمن کا نام لے کر ذکر کیا ہے۔

65- محمد ابن اسحٰق، سیرت رسول اللہ، Guillaume، ''لائف آف محمدؐ''، ص 130-31۔

66- ایضاً، Guillaume، ''لائف آف محمدؐ''، ص 132۔

67- محمد ابن اسحٰق، سیرت رسولؐ اللہ، Guillaume، ''لائف آف محمدؐ'' میں، ص 157۔

68- ایضاً، Guillaume، ''لائف آف محمدؐ''، ص 158۔

69- رضا اسلان، *No god but God*، ص 46۔

70- قرآن 11:100۔

71- قرآن 2:100، 13:37، 16:101، 17:41، 17:86۔

72- قرآن 109۔

73- قرآن 2:256۔

3- ہجرت

1- محمد ابن اسحٰق، سیرت رسولؐ اللہ، Guillaume، ''لائف آف محمدؐ'' میں، ص 169-70۔

2- ایضاً، 280، Guillaume، ''لائف آف محمدؐ'' میں، ص 193۔

3- قرآن 46:29-32، 72:1۔

4- قرآن 17:1۔

5- محمد ابن جریر الطبری، ''تاریخ الرسول والامم والملوک،'' 2210؛ محمد اے بامیہ، The Social Origins of Islam: Mind, Economy, Discourse (منی پولس، 1999ء)، صفحات 144-45۔

6- قرآن 53:15-18۔

7- قرآن Michael Sells، Approaching the Quran: The Early Revelations، صفحات xvii-xviii۔

8- محمد ابن اسحٰق، سیرت رسول اللہؐ، Guillaume، ''لائف آف محمدؐ،'' میں، ص 271۔

9- قرآن 3:84، 2:136۔

10- Toshihiko Izutsu کی Ethico-Religious Concepts in the Quran (مانٹریال اینڈ کنگسٹن، ON، 2002ء)، ص 189۔

11- قرآن 3:85۔

12- قرآن 12:111۔

13- قرآن 5:69۔

14- قرآن 5:48۔

15- قرآن 24:35۔

16- مارٹن لنگز کی ''Muhammad: His Life Based on the Earliest Sources'' (لندن، 1983ء)، صفحات 57، 105-111؛ ڈبلیو منٹگمری واٹ، Muhammad at Mecca (آکسفورڈ، 1953ء)، صفحات 141-49؛ ڈبلیو منٹگمری واٹ، Muhammad at Medina (آکسفورڈ، 1956ء)، صفحات 173-231۔

17- رضا اسلان، No god but God, The Origins, Evolution and Future of Islam (نیویارک و لندن، 2005ء)، 54؛ Gordon Newby، A History of the Jews in Arabia (کولمبیا، SC، 1988ء)، صفحات 75-79، 84-85؛ Moshe Gil،

Jerusalem Studies in Arabic "،Origin of the Jews of Yathrib" and Islam (1984ء)۔

18- محمد ابن عمر الواقدی، "کتاب المغازی"، "اسلان، No god but God میں، ص54۔

19- ابن اسحٰق، سیرت رسول اللہ، Guillaume، "لائف آف محمدؐ" میں، ص287۔

20- ایضاً289، بامیہ، Social Origins of Islam میں، صفحات153-54۔

21- ایضاً، Guillaume، "لائف آف محمدؐ" میں، صفحات291-2۔

22- بامیہ، Social Origins of Islam میں، ص153۔

23- قرآن5:5-7، رسولوں کے اعمال15:19-21، 29۔

24- قرآن10:47۔

25- قرآن8:30، 27:48-51۔

26- قرآن60:1، 47:13۔

27- ڈبلیو منٹگمری واٹ، Muhammad at Mecca: History in the Quran (ایڈنبرگ، 1988ء)، صفحات 101-6؛ Muhammad at Mecca (آکسفورڈ، 1953ء)، صفحات149-51۔

28- واٹ، Muhammad at Mecca (آکسفورڈ، 1953ء)، ص25۔

29- Izutsu کی Ethico-Religious Concepts in the Quran، ص56۔

30- ابن اسحٰق، سیرت رسول اللہ، Guillaume، "لائف آف محمدؐ" میں، ص297۔

31- ایضاً، صفحات304-5۔

32- بامیہ، Social Origins of Islam میں، صفحات216-217۔

33- اسلان، No god but God میں، صفحات56-59۔

34- ابن اسحٰق، سیرت رسول اللہ، Guillaume، "لائف آف محمدؐ"۔

35- قرآن9:40۔

36- Clinton Bennet، "Islam"، Sacred Place (لندن، 1994ء)، 88-89؛ فاطمہ

مرنیسی، Women and Islam: An Historical and Theological Enquiry، صفحات 106-108۔

37- ابن اسحٰق، سیرت رسول اللہ، Guillaume، "لائف آف محمدؐ" میں، ص 236۔

38- ایضاً، Guillaume، "لائف آف محمدؐ" میں، ص 414۔

39- بامیہ، The Social Origins of Islam، ص 218۔

40- قرآن 8:72-73۔

41- ابن اسحٰق، سیرت رسول اللہ، Guillaume، "لائف آف محمدؐ" میں، ص 232۔

42- قرآن 43:37-43۔

43- ابن اسحٰق، سیرت رسول اللہ، میں، ص 386، Izutsu کی Ethico-Religious Concepts in the Quran میں ترجمہ، ص 29۔

44- قرآن 4:137۔

45- قرآن 2:8-15۔

46- ابن اسحٰق، سیرت رسول اللہ، Guillaume، "لائف آف محمدؐ" میں، ص 341۔

47- واٹ، Muhammad at Medina، ص 201-2۔

48- D.S. Margoliouth، The Relations between Arabs and Israelites Prior to the Rise of Islam (لندن، 1924ء)؛ Hannah Rahman، "The Conflict between the Prophet and the Opposition in Medina"، Der Islam (1985ء)؛ Moshe Gil، "The Medinan Opposition to the Prophet"، Jerusalem Studies in Arabic and Islam (1987ء)۔

49- S.N Goitien، Jews and Arabs (نیویارک، 1960ء)، ص 63؛ Newboy، History of the Jews، 78-90؛ Aslan، No god but God، صفحات 97-98۔

50- David J. Helperin، "The Ibn Sayyad Traditions and the Legend of al-Dajjal"، Journal of the American Oriental Society (1976ء)۔

51-ابن اسحٰق، سیرت رسول اللہ، Guillaume، ''لائف آف محمدؐ''، میں، ص 362۔

52- قرآن 6:151۔

53- قرآن 2:111-113، 120۔

54- قرآن 2:116، 19:88-92، 10:68، 5:73-77، 116-118۔

55- قرآن 5:73۔

قرآن 3:115-56۔

57- قرآن 2:67-68۔

58- قرآن 3:65۔

59- قرآن 3:67۔

60- قرآن 6:159۔

61- قرآن 6:161-3۔

62- قرآن 2:144۔

63- قرآن 2:150۔

4- جہاد

1- محمد اے بامیہ، The Social Origins of Islam: Mind, Economy, Discourse (منی پولس، 1999ء)، ص 198۔

2- ڈبلیو منٹگمری واٹ، Muhammad at Medina، (آکسفورڈ 1956ء) صفحات 2-5۔

3- قرآن 2:216۔

4- قرآن 22:36-40۔

5- قرآن 2:190۔

6- واٹ، Muhammad at Medina، صفحات 6-8؛ محمد اے بامیہ، The Social Origins of Islam: Mind, Economy, Discourse، 198-199؛ G.S.

The Venture of Islam: Conscince and History in a ،Hodgson World Civilization، جلد 3 (شکاگو اور لندن، 1974ء)، 1:175-76؛ Tor Andrae، Muhammad: The man and His Faith، ترجمہ Theophil Menzel (لندن، 1936ء)، 195-201۔

7- قرآن 2:217۔

8- محمد اے بامیہ، The Social Origins of Islam، صفحات 200، 231؛ Tor Andrae، Muhammad: The man and His Faith، صفحات 6-203؛ واٹ، Muhammad at Medina، صفحات 8-6؛ مارٹن لنگز، "Muhammad: His Life Based on the Earliest Sources" (لندن، 1983ء)، صفحات 59-138۔

9- ابن اسحٰق، سیرت رسول اللہ، Guillaume، "لائف آف محمدؐ" میں، ص 435۔

10- ایضاً۔

11- قرآن 9-8:5۔

12- محمد ابن جریر الطبری، "تاریخ الرسل والامم والملوک،" منقول از فاطمہ مرنیسی، Women in Islam، ص 90۔

13- قرآن 8:8۔

14- ابن اسحٰق، سیرت رسول اللہ، Guillaume، "لائف آف محمدؐ" میں، ص 442۔

15- قرآن 47:5

16- قرآن 48-3:147، 17-8:16، 6:15۔

17- قرآن 94-2:193۔

18- قرآن 63-8:62۔

19- قرآن 5:45۔

20- قرآن 4:90۔

21- رضا اسلان، No god but God, The Origins, Evolution and Future of

Islam (نیویارک ولندن، 2005ء)، صفحات 89-90؛ واٹ، *Muhammad at Medina*، صفحات 225-43۔

22- Nabia Abbott، *Aishah, the Beloved of Muhammad* (شکاگو، 1992ء)، ص 67۔

23- فاطمہ مرنیسی، *Women and Islam: An Historical and Theological Enquiry*، صفحات 106-11۔

24- محمد البخاری، ''الصحیح'' (بیروت، 1978ء)، فاطمہ مرنیسی، *Women and Islam*؛ صفحات 142-3؛ لیلہ احمد، *Women and Gender in Islam* (نیوہیون اور لندن، 1992ء)، صفحات 52-53۔

25- ابن اسحٰق، سیرت رسول اللہؐ، Guillaume، ''لائف آف محمدؐ'' میں، ص 543۔

26- رضا اسلان، *No god but God, The Origins, Evolution and Future of Islam* (نیویارک ولندن، 2005ء)، صفحات 89-90؛ Andrae, *Muhammad*، ص 207؛ واٹ، *Muhammad at Medina*، صفحات 190-210۔

27- ابن اسحٰق، سیرت رسول اللہؐ، Guillaume، ''لائف آف محمدؐ'' میں، ص 296۔

28- M.J. Kister، ''Al-Hira: Some Notes on its Relations with Arabia''، *Jerusalem Studies in Arabic and Islam* 6 (1985ء)۔

29- Lings، *Muhammad*، صفحات 170-97؛ Andrae، *Muhammad*، صفحات 210-213؛ واٹ، *Muhammad at Medina*، صفحات 20-30۔

30- ابن اسحٰق، سیرت رسول اللہؐ، Guillaume، ''لائف آف محمدؐ'' میں، ص 717۔

31- قرآن 3-3:4۔

32- واٹ، *Muhammad at Medina*، صفحات 272-83، 289-93؛ Ahmed، *Women and Gender in Islam*، صفحات 43-44، 52۔

33- فاطمہ مرنیسی، *Women and Islam*، صفحات 123، 182۔

34- قرآن 24:33، Arthur J. Arberry، The Koran Interpreted (آکسفورڈ، 1964ء)۔

35- فاطمہ مرنیسی، Women and Islam: An Historical and Theological Enquiry، ص53۔

36- Lings، Muhammad، صفحات 203-4؛ واٹ، Muhammad at Medina، صفحات185، 211-1؛ رضا اسلان، No god but God، صفحات 201-2۔

37- Lings، Muhammad، صفحات 207-08۔

38- قرآن 24:53، 32:29، 46۔ واٹ، Muhammad at Medina، صفحات 231-4۔

39- قرآن 4:102؛ Lings، Muhammad، صفحات 208-10؛ فاطمہ مرنیسی، Women and Islam، صفحات 163-7۔

40- Lings، Muhammad، صفحات 211-212؛ فاطمہ مرنیسی، Women and Islam، ص172۔

41- قرآن 49:2, 4-5۔

42- محمد ابن سعد، ''طبقات الکبریٰ'' (بیروت)، 8:174؛ فاطمہ مرنیسی، Women and Islam، ص172۔

43- Lings، Muhammad، صفحات 107-8؛ فاطمہ مرنیسی، Women and Islam، ص174۔

44- طبری، ''تفسیر''، صفحات22:10؛ فاطمہ مرنیسی، Women and Islam، ص174۔

45- قرآن 33:35۔

46- قرآن 4:37۔

47- قرآن 4:23۔

48- قرآن 2:225-40، 65:1-70۔

49- طبری، ''تفسیر''، 9:235؛ فاطمہ مرنیسی، Women and Islam، صفحات 131-32؛

احمد، *Women and Gender in Islam*، ص53۔

50- قرآن4:19۔

51- طبری، ''تفسیر'' 8:261؛ فاطمہ مرنیسی، *Women and Islam*، ص132۔

52- فاطمہ مرنیسی، *Women and Islam*، صفحات154-59۔

53- ابن سعد، ''طبقات'' 8:205۔

54- ایضاً۔

55- قرآن4:34۔

56- ابن سعد، ''طبقات'' 8:204۔

57- Lings، *Muhammad*، صفحات 215-30؛ واٹ، *Muhammad at Medina*، صفحات36-58؛ فاطمہ مرنیسی، *Women and Islam*، صفحات168-70۔

58- ابن اسحٰق، سیرت رسول اللہؐ، Guillaume، ''لائف آف محمدؐ'' میں، ص677۔

59- قرآن33:12۔

60- قرآن33:10-11۔

61- ابن اسحٰق، سیرت رسول اللہؐ، Guillaume، ''لائف آف محمدؐ'' میں، ص677۔

62- ایضاً، ص689۔

63- رضا اسلان، *No god but God*، صفحات91-98؛ Norman A. Stillman، *The Jews of Arab Lands* (فلاڈلفیا، 1979ء)۔

64- قرآن29:46۔

5- سلام

1- محمد ابن عمر الواقدی، ''کتاب المغازی'' صفحات 488-490، مارٹن لنگز کی *Muhammad: His Life Based on the Earliest Sources* (لندن، 1983ء)، ص227۔

2- فاطمہ مرنیسی، Women and Islam: An Historical and Theological Enquiry، (آکسفورڈ، 1991ء)، صفحات 171-172۔

3- قرآن 33:51, 63۔

4- قرآن 33:59-60۔

5- Lings، Muhammad، صفحات 212-214؛ Tor Andrae، Muhammad: The man and His Faith، ترجمہ Theophil Menzel (لندن، 1936ء)، صفحات 215-216۔

6- قرآن 33:36-40۔

7- قرآن 33:53۔

8- قرآن 33:53, 59۔

9- فاطمہ مرنیسی، Women and Islam، صفحات 88-191؛ لیلہ احمد، Women and Gender in Islam (نیوہیون اورلندن، 1992ء)، صفحات 53-57۔

10- فاطمہ مرنیسی، Women and Islam، صفحات 177-78؛ Lings، Muhammad، صفحات 235-45؛ ڈبلیو منٹگمری واٹ، Muhammad at Medina (آکسفورڈ، 1956ء) 185-86؛ لیلہ احمد، Women and Gender in Islam، ص 51۔

11- ابن اسحٰق، سیرت رسول اللہ، Guillaume، ''لائف آف محمدؐ'' میں، ص 726۔

12- قرآن 12:18۔

13- ابن اسحٰق، سیرت رسول اللہ، Guillaume، ''لائف آف محمدؐ'' میں، ص 735۔

14- قرآن 24:11۔

15- Lings، Muhammad، صفحات 247-55؛ Tor Andrae، Muhammad، صفحات 219-27؛ واٹ، Muhammad at Medina، 46-59، 234-35؛ محمد اے بامیہ، The Social Origins of Islam: Mind, Economy, Discourse (منی پولس، 1999ء)، صفحات 222-27۔

16-ابن اسحٰق، سیرت رسول اللہ، Guillaume، ''لائف آف محمدؐ'' میں، ص 748۔

17-ایضاً، ص 741۔

18-ایضاً، ص 743۔

19-ایضاً۔

20-ایضاً، ص 745۔

21-واٹ، Muhammad at Medina، ص 50۔

22-قرآن 2:193۔

23-ابن اسحٰق، سیرت رسول اللہ، Guillaume، ''لائف آف محمدؐ'' میں، ص 748۔

24-ایضاً، 747۔

25-محمد اے بامیہ، The Social Origins of Islam، صفحات 226-27۔

26-فاطمہ مرنیسی، Women and Islam، صفحات 184-86۔

27-ابن اسحٰق، سیرت رسول اللہ، Guillaume، ''لائف آف محمدؐ'' میں، ص 747۔

28-ایضاً، ص 748۔

29-Lings، Muhammad، ص 254۔

30-ایضاً، ص 255۔

31-قرآن 48:26، ترجمہ از Toshihiko Izutsu کی Ethico-Religious Concepts in the Quran (مانٹریال اینڈ کنگسٹن، ON، 2002ء)، ص 31۔

32-قرآن 48:29، Arthur J. Arberry، The Koran Interpreted (آکسفورڈ، 1964ء) میں۔

33-ابن اسحٰق، سیرت رسول اللہ، Guillaume، ''لائف آف محمدؐ'' میں، ص 751۔

34-قرآن 110۔

35-ابن سعد، ''کتاب الطبقات الکبیر'' 7:147، Lings، Muhammad، ص 271 میں۔

36-Lings، Muhammad، ص 282۔

37-ابن اسحٰق، سیرت رسول اللہؐ، Guillaume، ''لائف آف محمدؐ'' میں، ص717۔

38- قرآن17:82۔

39-ابن اسحٰق، سیرت رسول اللہؐ، Guillaume، ''لائف آف محمدؐ'' میں، ص821۔

40- قرآن49:13۔

41- ابوجعفر الطبری، ''طریق الرسول والملوک''، Guillaume، ''لائف آف محمدؐ'' میں، ص1642۔

42-Lings، *Muhammad*، ص311۔

43-ابن اسحٰق، سیرت رسول اللہؐ، Guillaume، ''لائف آف محمدؐ'' میں، ص886۔

44-بامیہ، *Social Origins of Islam*، 227-29۔

45-واقدی، *Social Origins of Islam* میں 228۔

46-ابن اسحٰق، سیرت رسول اللہؐ، Guillaume، ''لائف آف محمدؐ'' میں، ص969۔

47-ایضاً، 1006۔

48-ایضاً، 1006۔

49-ایضاً، 1012۔

50- قرآن3:144۔

51-ابن اسحٰق، سیرت رسول اللہؐ، Guillaume، ''لائف آف محمدؐ'' میں، ص1013۔

52- Wilfred Cantwell Smith، *Islam in Modem History* (پرنسٹن اور لندن، 1957ء)، ص305۔

پیغمبرِ امن ﷺ

ایک راہنما شخصیت کے طور پر حضرت محمد ﷺ کی سیرت نہ صرف مسلمانوں بلکہ اہلِ مغرب کے لیے بھی اہم اسباق رکھتی ہے۔ آپ ﷺ کی زندگی ایک جہاد تھی: اس لفظ کا مطلب صرف ''مقدس جنگ'' نہیں بلکہ ''جدوجہد'' ہے۔ حضرت محمد ﷺ نے جنگ زدہ عریبیہ میں امن قائم کرنے کی سخت کوشش کی، اور آج ہمیں یہ کام کرنے والے لوگوں کی ضرورت ہے۔ آپ ﷺ کی زندگی طمع، ناانصافی اور جہالت کے خلاف ایک متواتر جدوجہد سے عبارت تھی۔ آپ ﷺ نے محسوس کیا کہ عریبیہ ایک اہم موڑ مڑ رہا تھا اور سوچ کے پرانے انداز کافی نہیں رہے تھے، چنانچہ آپ ﷺ خود میدانِ عمل میں اترے تاکہ ایک بالکل نیا حل وضع کر سکیں۔ 11 ستمبر کے بعد ہمیں ایک مختلف نکتۂ نظر پیدا کرنے کے لیے اتنی ہی تندہی سے کوشش کرنا ہوگی۔

ساتویں صدی کے عریبیہ میں رونما ہونے والے واقعات ہمیں اپنے عہد کے واقعات اور ان کی تہہ میں موجود اہمیت کے متعلق کافی کچھ سکھاتے ہیں۔ یہ اسباق سیاست دانوں کی کھوکھلی نعرہ بازی کی نسبت کہیں زیادہ عمیق ہیں۔ حضرت محمد ﷺ راسخ العقیدگی نافذ کرنے کی کوشش میں نہیں تھے۔ آپ ﷺ کو مابعد الطبیعیات میں زیادہ دلچسپی نہ تھی۔ بلکہ آپ ﷺ لوگوں کے ذہنوں اور دلوں میں تبدیلی پیدا کرنا چاہتے تھے۔